علمی اجالے

مؤلفہ

امیر حسن نورانی

ناشر

راجہ رام کمار بک ڈپو

: وارث :

منشی نول کشور بکڈپو لکھنؤ

چند ادبی جواہرات

مؤلفہ

امیر حسن نورانی

۱- اردو کے چاند تارے یعنی شعرائے اردو کا مصور تذکرہ مجلد ۳/۵۰

۲- تعارف میر تقی میر -/۴۲

۳- تعارف نظیر اکبر آبادی -/۷۵

۴- تعارف مومن -/۵۰

۵- تعارف چکبست -/۲۶

۶- گلستاں کی کہانیاں -/۷۵

ناشر

راجہ رام کمار بکڈپو وارث نولکشور بکڈپو لکھنؤ

علمی اُجالے

تحقیقی علمی اور ادبی مقالات

از

امیر حسن نورانی

ناشر

راجہ رام کمار بکڈپو، وارث نولکشور بکڈپو لکھنؤ

۱۹۵۹ء

علمی اُجالے

مُصنّف :- سید امیر حسن نورانی ۔ اُستاد ادبیات اسلامیہ کالج لکھنؤ

ناشر :- راجہ رام کُمار بک ڈپو ۔ لکھنؤ

طابع :- راجہ رام کُمار پریس ۔

قیمت :- مجلّد دو روپیہ (پچاس نئے پیسے)

سنِ اشاعت :- ۱۹۵۹ء

فہرست مضامین

انتساب

خلوص و محبّت کے گہرے جذبات کے ساتھ

میں اس علمی و ادبی گلدستہ کو اپنے محترم

اور عزیز بھائی ملک فتح خاں کے نام منسوب

کرتا ہوں۔

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

امیر حسن نورانی

لکھنؤ

کہنے کی باتیں

دنیا کی کوئی زبان ہو اسکی وسعت و ہمہ گیری اس وقت تسلیم کیجاتی ہے جب وہ تمام مروجہ علوم و فنون کو اپنے وسیع دامن میں سمیٹ لے، اور ہر قسم کی علمی اور فنی اصطلاحات و مطالب کی ترجمانی کر سکے، اور اسی کے ساتھ اس کے حسن و دلکشی میں کوئی کمی نہ ہو۔ دنیا میں ایسی زبانوں کی تعداد بہت کم ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ اردو زبان بھی دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہونے لگی ہے۔

گزشتہ نصف صدی میں اُردو نے حیرت انگیز ترقی کی، رکاوٹوں اور مخالفتوں کے باوجود اسکی ہر دلعزیزی میں فرق نہیں آیا، کیونکہ یہ ایک مہکتا ہوا حسین و نازک گلدستہ ہے جو عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی زبانوں کے منتخب اور نازک الفاظ کے خوشنما پھولوں سے بنا ہے اور ہندستان کی مشترکہ تہذیب اور تمدن کے مضبوط رشتہ سے مربوط ہے۔ یہ حسن و نزاکت کا دلکش امتزاج ہے جس نے اسکی رعنائی و دلکشی کو بڑھا دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں نہ تو اُردو اخبارات و رسائل کی کمی ہے نہ لکھنے والونکی

بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں کی تعداد پڑھنے والوں سے زیادہ ہو مگر یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ تمام نگارشات کا بڑا حصہ یا تو ناولوں اور افسانوں پر مشتمل ہوتا ہو یا شعر و شاعری سے متعلق مضامین پر۔ مشکل سے پانچ فیصدی خالص علمی و فنی مضامین ہوتے ہیں، حالانکہ ایسے مضامین کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔

پیشِ نظر کتاب "علمی اُجالے" میرے چند تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے متفرق علمی، ادبی اور تاریخی عنوانات پر لکھے ہیں خاص طور پر ایسے موضوع انتخاب کئے ہیں جن پر عام طور سے کم توجہ کی جاتی ہے، ان کی اشاعت سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اپنے مضامین یکجا کر دوں جیسا کہ موجودہ دور میں عام رواج ہوگیا ہو بلکہ میری غرض صرف یہ ہے کہ اہل قلم اپنی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو ایسے عنوانات پر صرف کریں جو افادیت اور مقصدیت کے حامل ہوں اور جن کے ذریعہ سے قدیم تاریخی اور علمی سلسلہ کی متفرق کڑیوں کو ملایا جاسکے اور ان سے جو اہم نتائج حاصل ہوں ان سے علمی دنیا کو استفادہ کا موقع ملے، اسی طرح وہ تاریخی گتھیاں بھی سُلجھ سکتی ہیں جو امتدادِ زمانہ سے اُلجھی ہوئی ہیں۔

"علمی اُجالے" میں چند تاریخی مضامین ہیں جو قدیم ہندستان کی علمی و ادبی عظمت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان روابط کا پتہ دیتے ہیں جو قدیم ہندستان اور ایشیا کے دوسرے ممالک کے درمیان قائم تھے، عرب و ہند اور ایران و ہند کے علمی اور سیاسی روابط پر دو مضمون ہیں جو اصل ماخذوں کی مدد سے لکھے گئے ہیں۔ ایک تفصیلی مضمون پنچ تنتر اور اس کے ترجموں سے متعلق ہے، یہ کتاب

ہندستان کا علمی شاہکار ہے اور میں نے اس کے متعلق تمام اہم معلومات تحقیق کے ساتھ پیش کی ہیں۔ تین مضمون اُردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانوں پر ہیں، اور ان میں جو باتیں ظاہر کی گئی ہیں وہ اُن سے قبل منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔

ایک تفصیلی مضمون اُردو خوشنویسی کی تاریخ اور تدریجی ترقی کے متعلق بھی شامل ہے۔ سوانحی مضامین اس مجموعہ میں شامل کرنے کا ارادہ نہ تھا مگر چند مضامین بعض خصوصیات کے باعث شامل کر دیے

ایک مضمون میں امام الغزالی کے علمی اور اخلاقی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، امام صاحب مفکرِ عالم اور ماہرین تعلیم میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں اور ان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

پہلی بار مولوی امیر علی ملیح آبادیؒ کے حالات پر میں نے ایک مختصر مضمون لکھا ہے، ان کے زبردست علمی کارناموں سے بہت کم لوگ واقف ہیں حالانکہ ان کے گرانقدر احسانات سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں، وہ ایک ایسے مترجم کی حیثیت سے ممتاز ہیں جنھوں نے حیرت انگیز تیز رفتاری سے عربی اور فارسی زبانوں کی کتابیں اُردو میں منتقل کر کے عظیم الشان علمی خدمت انجام دی، ایسی شخصیت کے حالات اور کارناموں پر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

ایک مفصل مقالہ منشی نول کشور کے حالات اور ان کی علمی خدمات پر بھی لکھا ہے یہ مقالہ اس حیثیت سے اہم ہے کہ منشی نول کشور اور ان کے عہد کے عام علمی و ادبی حالات پر اس سے قبل اتنی تفصیل سے کسی نے نہیں لکھا، اس مقالہ کی افادیت بہرحال مسلّم ہے۔

اودھ کے اسلامی "نظام تعلیم" کا اجمالی خاکہ بھی ایک مختصر مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک مضمون میں شعر و شاعری کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ چند اور مضامین بھی ہیں، جو کسی نہ کسی حیثیت سے محلِ فکر و نظر ہیں۔ ان مضامین میں سے اکثر اُردو کے معیاری رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور اب ان کو یکجا کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے، کتاب کی اشاعت اُردو کے سب سے قدیم اور بڑے ناشر راجہ رام کمار بُک ڈپو وارث مطبع منشی نول کشور کے اہتمام میں ہو رہی ہے۔ کتابت و طباعت کی صحت و صفائی کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ جس کے لئے میں مطبع کے ارباب حل و عقد کا شکر گزار ہوں۔

امیر حسن نورانی

امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ

۱۲ر مئی سنہ ۱۹۵۹ء

سنسکرت اور مسلمان

مسلمانوں نے سنسکرت اور ہندی دونوں زبانوں کی ترقی و ترویج کے سلسلہ میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ ان خدمات سے کہیں زیادہ شاندار ہیں جو ہندو ادیبوں اور شاعروں نے کی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کی خدمات ہنوز تاریکی میں ہیں اور ان کو منظر عام پر لانے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی گئی۔

مسلمان ہندستان آئے تو انھوں نے تھوڑی مدت میں سنسکرت کے بڑے بڑے عالم پیدا کئے۔ ہندی ادب اور شاعری کو انھوں نے ابتدائی دور سے اپنایا، مسلمان فرمانرواؤں نے ہندی اور سنسکرت کی سرپرستی کی ہندی کی تو خصوصاً پرورش کی اور اس کو پروان چڑھایا۔ ہندی شاعری کی داغ بیل ساتویں صدی عیسوی میں پڑی لیکن اس کے باقاعدہ آغاز کا پتہ دسویں صدی عیسوی سے چلتا ہے۔ ہندی کا باقاعدہ پہلا شاعر چند بردائی تھا جو لاہور میں پیدا ہوا تھا اور پرتھوی راج کے درباریوں میں شامل ہو گیا تھا، دسویں صدی عیسوی ہی میں ہندی کا ایک باکمال شاعر مسعود سعد سلمان بھی

گزرا ہے اس کا خاندان محمود غزنوی کے ساتھ ہندستان آیا تھا اور لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مسعود سعد لاہور ہی میں پیدا ہوا تھا اور صاحب دیوان ہندی شاعر تھا، اس کے ہندی دیوان کا ایک قلمی نسخہ راجپوتانہ کے کسی کتب خانے میں موجود تھا، سلمان کے ہمعصر ہندی کے مسلمان شعرا اور بھی تھے جن میں قطب علی اکرم اور فیض کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے۔

مسلمان شعرا، ہندی میں عام طور سے حضرت امیر خسرو دہلوی کی حیثیت بہت نمایاں ہے اور انھیں کو مسلمانوں میں سب سے پہلا باقاعدہ ہندی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اولیت کی تصریح تو کی جا چکی ہے، ہاں یہ حقیقت ہے کہ حضرت امیر خسروؒ دہلوی نے ہندی زبان میں بڑی مہارت حاصل اور باقاعدہ ہندی شاعری کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ امیر خسرو دہلوی سن ۱۲۳۶ء میں بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ (اتر پردیش) پیدا ہوئے تھے، باپ کا نام امیر سیف الدین محمود تھا، تمام مروجہ علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ ہندستان کے بڑے صوفیوں میں شمار کئے جاتے تھے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے اپنے زمانہ میں وہ ملک کے ایک باثر فرد تھے، ہندستانی علم موسیقی کے بانی، اور کئی راگوں کے موجد تھے۔ ان کے دلچسپ ہندی اشعار، پہیلیاں، چٹکلے، گیت اور دوہے زبان زدِ خاص وعام ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

چکوا چکوی دو جنے ان مت مارے کوئے
یہ مارے کرتار کے رین بچھوہا ہوئے

عورت کہہ رہی ہے کہ چکوا چکوئی (سرخاب کا جوڑا) دو متنفس ہیں۔ ان کو کوئی

نہ مارے، یہ دونوں خدا کے مارے ہوئے ہیں، کیونکہ دونوں رات بھر جدا رہتے ہیں، نر خاب پرند کا قاعدہ ہے کہ رات میں دونوں زیادہ تر جدا ہو جاتے ہیں، نر دریا کے ایک کنارے رہتا ہے، مادہ دوسرے کنارے اور دونوں رات بھر ایک دوسرے کو پکارتے رہتے ہیں، ایک عورت اسی جدائی سے متاثر ہو کر اس سے بہتر کیا جذبات ظاہر کر سکتی ہے۔

امیر خسرو کے علاوہ مسلمان صوفیائے کرام اور علمائے عظام میں بہت سے ایسے گزرے ہیں، جن کو ہندی سے ذوق پیدا ہوا، اور انھوں نے اسی زبان میں طبع آزمائی کی، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان صوفیا، کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے باشندوں میں مکارم اخلاق اور تزکیۂ نفس کی ترویج کی جائے اور اس مقصد کے لئے وہ عوام سے قریب تر رہتے تھے، ان کے پاس بغیر قید کے ہر مذہب وملت کے افراد آتے تھے اور ان صوفیا سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور محبت کرتے تھے، اور یہ عقیدت ان بزرگون کے انتقال کے بعد بھی قائم رہتی تھی، جس کے زندہ ثبوت آج بھی موجود ہیں، عوام سے قریبی تعلق کے باعث صوفیائے کرام جس علاقہ میں قیام کرتے تھے وہاں کی مقامی زبان کو بھی اپناتے تھے، اسی طرح ہندی زبان کو بھی انھوں نے اپنایا اور اپنے افکار و خیالات کی ترجمانی کے لئے اس کو منتخب کیا، صوفیائے کرام میں شیخ فریدالدین گنج شکر کے نام نامی سے کون ناواقف ہے آپ ۱۱۷۳ء میں پیدا ہوئے، خواجہ بختیار کاکی کے مرید اور خلیفہ تھے، ان کا قیام پنجاب کے مقام پاک پٹن میں رہا اور وہیں ۱۲۶۵ء میں انتقال ہوا، ہندی زبان میں آپ کے اشعار کثرت سے ہیں، لیکن متفرق کتابوں میں منتشر ہیں، اگر ان کو یکجا کیا جائے تو اچھا خاصہ مجموعہ

مرتب ہو سکتا ہے، دو شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں ؎

اسا کیری یہی سورت — جاؤں نائے کہ جاؤں میت
دیش سلہٹ سے گر بٹے ہوئے — بو کڑواں ہے نہ کوئی بٹے ہوتے

ہندوستان میں اسلامی علوم کے بہت بڑے عالم علامہ شیخ علی متقی بھی ہندی زبان کے اچھے شاعر اور ادیب تھے، آپ کا وطن جونپور تھا، گجرات کے حکمران آپ کے معتقد تھے۔ آپ نے بعض مجبوریوں کے باعث ترک وطن کرکے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، لیکن ہندوستان آنے جانے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا، آپ کا انتقال بھی مکہ معظمہ ہی میں ہوا، انتقال کے زمانے میں جو شعر کہا تھا وہ ہندی میں تھا۔ فرماتے ہیں ؎

سُن سہیلی پریم کی باتا
یوں مل رہے جیوں دودھ تباتا

۱۶۹۵ء سے ۱۷۲۳ء کے درمیان دہلی میں پاری صاحب نام کے ایک بڑے درویش گزرے ہیں، وہ ہندی زبان کے اچھے شاعر تھے، ہندی کا مشہور شاعر کیشو داس انھیں کا شاگرد تھا۔

حضرت مخدوم شیخ عبدالحق ردولویؒ بڑے پایہ کے بزرگ تھے ان کے مریدین اور معتقدین کی تعداد لاکھوں تک پہنچی تھی، ہندو مسلمان سب ہی ان کے معتقد تھے، ان کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا، عرصہ تک پنجاب میں قیام رہا، اس کے بعد اودھ کے مشہور قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی کو آپ نے اپنا مسکن بنایا۔ ۱۴۲۷ء میں ردولی ہی میں انتقال ہوا اور مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔ آپ کو ہندی زبان سے محبت تھی، اکثر اشعار ہندی میں کہا کرتے تھے، آپ کے دوہے

بہت مشہور ہیں، ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

کنواں ہو تو پاٹوں سمندر کہ پاٹن جائے

بارا ہو تو برجوں ھیل کہ برجن جائے

مولانا سید محمد جونپوری زبردست عالم تھے، سنہ ۱۴۴۳ء میں جونپور میں پیدا ہوئے، آپ کو ہندی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں کمال حاصل تھا، آپ کے ہندی دوہے تدتوں زبان زد خاص و عام رہے ونمونۂ کلام ملاحظہ ہو ۔

ہوں بلہاری سجنا ہوں بلہار ہوں سرجن سہرا سجن مجھ گل ہار

چندر کہے نرائن کو سو سچ دیکھ آئے ایسا بھگونت بھئے دشت پاپچھ رجائے

آپ کا انتقال سنہ ۱۵۰۴ء میں بلوچستان کے مقام فرخ میں ہوا۔

اسی طرح شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ہندستان کے مشہور عالم اور درویش تھے، سنہ ۱۴۵۵ء میں پیدا ہوئے، عربی فارسی کے زبردست فاضل تھے، شاعری کا ذوق بھی تھا، ہندی زبان کا شوق ہوا تو اسے باقاعدہ حاصل کیا اور ہندی میں شعر و شاعری کرنے لگے، اس کے لئے الکھ رس تخلص اختیار کیا، کلام میں تصوف کا رنگ نظر آتا ہو نمونے میں ۔

جنگ ناہیں بابجھ بوجھ برہم گیان پانی سو بلبلا سوئے سد در جان

ایکی ادا ہو ایکی سر و ایکی سانس گرگھ بوجھ برہم گیان بین سرلوک ایک بھان

ان چند بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن اگر تحقیق و تجسس کیا جائے تو یہ فہرست سیکڑوں تک پہنچ سکتی ہے، ابوالفضل، فیضی اور ملا عبدالقادر بدایونی جیسے یکتائے روزگار علماء سنسکرت و ہندی کے بھی زبردست عالم تھے، فیضی نے مہابھارت اور نل دمن کا فارسی ترجمہ کیا تھا، یہاں تک تو صوفیائے کرام اور علمائے اسلام کی

ہندی اور سنسکرت کی خدمات کا اجمالی تذکرہ تھا، اب ہم اُن عام شعراء ہندی کے حالات اور خدمات پر روشنی ڈالیں گے اور اسی کے ساتھ ساتھ مسلمان سلاطین اور وزراء کی ان خدمات کا جائزہ لیں گے جو انھوں نے ہندی کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں انجام دی ہیں۔

سلطان زین العابدین کشمیر کا ایک مشہور حکمران گزرا ہے۔ خود بھی صاحب علم و فضل تھا اور بڑا علم دوست، اسکی ہندی نوازی مشہور ہے، اس کا زمانہ اکبر سے کچھ پہلے گزرا ہے۔ مہابھارت کا فارسی میں سب سے پہلے اسی نے ترجمہ کرایا تھا، پھر عہد اکبری میں فیضی نے ترجمہ کیا تھا، کشمیر کی تاریخ بھی اسی سلطان کے عہد میں اس کے حکم سے ہندی زبان میں لکھی گئی تھی۔

ابراہیم عادل شاہ دکن کا مشہور فرمانروا گزرا ہے، اکبر سے کچھ پہلے اسکا زمانہ تھا، انکی ہندی نوازی اور ہندی دانی مشہور ہے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ اس کے دربار میں ہندی رائج تھی۔

شہنشاہ اکبر کا عہد تو ہندی کے عروج عہد کہا جا سکتا ہے، اس عہد میں ہندی کی ساخت و پرداخت بہت ہوئی، خود اکبر ہندی میں شعر کہتا تھا، اور ہندی زبان کی نشر و اشاعت کا بانی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے جہانگیر کو ہندی سکھائی اور اپنے پوتے خسرو کی تعلیم کے لئے چھ سال کی عمر میں ایک برہمن کو معلم مقرر کیا، اکبر نے تان سین کو جو ہندی کا شاعر اور ماہر موسیقی تھا، پہلے ہی دفعہ دو لاکھ روپیہ انعام دیا تھا۔

عبدالرحیم خان خاناں کو ہندی شاعری کا جگت گرو مانا جاتا ہے، اکبر اعظم کا وزیر خاص اور بیرم خاں کا لڑکا تھا ۱۵۵۳ء میں پیدا ہوا، ہندی، سنسکرت،

عربی اور فارسی کا زبردست عالم تھا، شعر و شاعری میں اس کو کمال حاصل تھا، اور شعرا، کا قدر دان تھا۔ اس کا ہندی اور سنسکرت کا کلام بہت بلند ہوتا تھا، ماہرین ہندی کا خیال ہے کہ اس کا پایہ ملک محمد جائسی سے بھی بلند تھا، اس نے ہندی شاعری کو بہت ترقی دی، اس کے کلام میں ایک طرف عشق و محبت کی چاشنی تو دوسری طرف حقائق و معارف کی گہرائیاں ہیں، اخلاق و فلسفہ کی آئینہ داری ہے، ملاحظہ ہو ؎

کمتا کر کر پورا جاتک ترستھ ہوئے
اب تو پڑھو رحیم کتھل بش ہوئے

یعنی اے رحیم پانی بھی کیا چیز ہے: ایک طرف پیاسے کی پیاس بجھاتا ہے دوسری طرف سمندر میں گرتا ہے تو اس سے موتی پیدا ہوتے ہیں، کیلے میں پڑتا ہے تو کافور پیدا ہوتا ہے، سانپ کے منہ میں گرتا ہے تو زہر قاتل بن جاتا ہے اسی طرح انسان جیسی صحبت اختیار کرتا ہے ویسے ہی اس کے عادات و اطوار ہوتے ہیں۔ ایک شعر ہے ؎

کام نہ کا ہو آئی مول نہ کوڈیئے
باز و ٹوٹے باز کو سہاے چارہ دیئے

یعنی جب بلند پروازی کرنے والا، اپنی قوت سے شکار کرنے والا باز کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے پر ٹوٹ جاتے ہیں اس وقت انسان اسکی قدر نہیں کرتا ہے، نہ اس کو خریدتا ہے۔ ایسے وقت بھی اللہ تعالیٰ اس کو غذا پہنچاتا ہے، کیونکہ اس کو اپنی سب مخلوق کا خیال ہے۔

رحیم کی ہندی میں بہت سی تصانیف ہیں جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

رحیم ست سئی۔ سنگار سورتھ۔ رس پنچادھیائی۔ بردے نائکہ بھید

اکبر کے دور میں ہندی کے مسلمان شعرا بہت زیادہ تھے، اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تخت حکومت پر بیٹھا تو اس نے بھی خوب ہندی نوازی کی، اکبر کے عہد نے رحیم جیسا بلند پایہ شاعر پیدا کیا تو جہانگیر کے عہد حکومت میں ملک محمد جائسی جیسا نادر روزگار ہندی شاعر ظاہر ہوا جس نے ہندی شاعری کو بہت عروج بخشا ملک محمد کی مشہور ہندی مثنوی پدماوت ہندی زبان کا شاہکار سمجھا جاتا ہے جائسی قصبہ جائس ضلع رائے بریلی (اودھ) کا رہنے والا تھا، اس کے دوہے نہایت مقبول ہیں، درد و اثر سے اس کا کلام بھرا ہوا ہے حسن و عشق کے واردات کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ پی سو کہیو۔

یعنی اے بھونرے اے کوے میرے محبوب سے یہ پیغام کہنا کہ تمہاری محبوبہ جدائی کی آگ میں جل مری۔ اس کے جلنے اور آہوں سے جو دھواں اٹھا وہ میرے لگ گیا جس کے اثر سے دونوں کالے ہو گئے۔

ملا مسیح پانی پتی عہد جہانگیر میں ہندی کے مشہور شاعر تھے، سنسکرت قواعد میں ان کو مہارت حاصل تھی، رامائن کا فارسی ترجمہ اشعار میں کیا جو رامائن مسیحی کے نام سے مشہور ہے اور نولکشور پریس سے شائع ہو چکی ہے، اسی عہد میں ضمیر جیسا بلند پایہ ہندی شاعر بھی تھا جس کی کتاب "پرجتک" بہت مشہور ہے۔

غواصی بھی اسی دور کا ہندی شاعر تھا جس نے طوطی نامہ کا ترجمہ فارسی سے ہندی نظم میں کیا تھا، ملا نوری۔ شیخ محمد بن شیخ معروف دونوں ہندی کے اچھے شاعر تھے جن کا تذکرہ آزاد بلگرامی نے کیا ہے۔

عثمان اور نور محمد بھی جہانگیر کے زمانہ میں تھے اور دونوں ہندی کے زبردست شاعر تھے، عثمان کی کتاب چترادلی بہت مشہور ہے، قطب بھی اسی زمانہ میں تھا جس میں معیاری ہندی نظم کی کتابیں شلاً مرگاوتی - پریم وتی اور مدھومالتی وغیرہ لکھی گئیں -

جب شاہ جہاں ہندوستان کے تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس نے بھی زبان و ادب کو اسی طرح ترقی دی جیسے اس کے باپ جہانگیر نے اس کے عہد میں بھی ہندی کے اچھے اچھے شاعر پیدا ہوئے اور شاہجہاں کی فیاضیوں نے ان کے حوصلے بڑھائے، وہ خود ہندی جانتا تھا، اس نے اپنے لڑکوں کو بھی ہندی کی تعلیم دلوائی تھی، اس کا بڑا لڑکا دارا ہندی اور سنسکرت کا عالم تھا اور اس نے اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، شاہجہاں نے ہندی کے شعراء کو بڑے بڑے انعامات دیے، ایک ہندی شاعر کو روپیہ میں تلوایا اور وہ روپیہ اسی کو دے دیا، اس فیاضی، اور قدردانی نے ہندی کو ترقی کا خوب موقع دیا، اس عہد میں قصبہ بلگرام میں کئی اچھے ہندی کے مسلمان شاعر نمایاں ہوئے -

شاہ جہاں کی ہندی نوازی کا اثر اس کے بیٹے اورنگ زیب عالمگیرؒ پر بھی غالب تھا، اس لئے جب عالمگیرؒ ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تو اس نے بھی ہندی کی سرپرستی کی بلکہ اس نے شاہ جہاں سے زیادہ، ہندی نوازی کا ثبوت دیا -

اورنگ زیب خود اچھا ہندی داں تھا، اس کا درباری شاعر ورند بہت مشہور ہے جسے اخلاقی شاعری میں بڑا ملکہ حاصل تھا اور بھی ہندی کے کئی شاعر اس دربار سے تعلق رکھتے تھے احمد اور نگ زیب ان کی حوصلہ افزائی میں کوئی کمی نہیں کرتا تھا،

عالم ہندی کا مشہور شاعر گزرا ہے جو اس کے بیٹے شاہزادہ معظم کا درباری شاعر تھا۔

اورنگ زیب کا پوتا عظیم الشان ہندی شاعری سے بہت ذوق رکھتا تھا جب وہ بنگال واڑیسہ کا صوبہ دار ہوا تو ورندکو اورنگ زیب کی اجازت سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

سید نظام الدین بلگرامی ہندی کے فاضل اور شاعر تھے، ان کا تعلق بھی اورنگ زیب ہی کے دربار سے رہا۔ نوچندریکھا اور مدھناتک سنگار وغیرہ انکی مشہور کتابیں ہیں، انھیں کے عزیز سید عبدالجلیل بلگرامی ہندی و سنسکرت کے عالم تھے، اور قادر الکلام شاعر بھی، ان کے علاوہ حسب ذیل ہندی کے مسلمان شعرا عہد اورنگ زیب میں قابل ذکر ہیں۔

رجب شاہ مصنف "سکھی گرنتھ"۔

دانش خاں مصنف "سنگار درپن"۔

نوراللہ مصنف "سرچندریکا"۔

قاسم شاہ مصنف "ہنس جواہر"۔

خیراتی خاں مصنف "دیوساگری"۔

ان کے علاوہ اور بھی باکمال شاعر موجود تھے۔ داراشکوہ خود ہندی کا شاعر تھا اور شعراء کی قدر کیا کرتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ خاندان مغلیہ کے تمام فرمانرواؤں نے ہندی زبان اور شاعری کی ترقی میں جو غیر معمولی دلچسپی لی اسکی مثال شاید و باید ہی ملے گی۔

ہندی کے باکمال شعراء میں مبارک علی مبارک بلگرامی بہت مشہور ہیں انھوں نے "الک شتک" اور "تل شتک" دو کتابیں ہندی نظم میں تصنیف کی تھیں، اسی طرح سید رحمت اللہ رحمت بلگرامی جو مشہور ہندی شاعر چنتامنی کے معصر تھے اور شاہ جہاں کے شہزادہ شاہ شجاع کے مدح سرا تھے، اپنے دلکش دوہوں کی وجہ سے ہندی شاعری میں بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔

عبدالرحمن رحمن اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ معظم کے منصب دار تھے، اور ہندی کے بلند پایہ شاعر تھے، ان کی کتاب "یمک شتک" موجود ہے۔

غلام نبی رسلین ہندستان کے مشہور ادیب و شاعر سید عبدالجلیل بلگرامی کے بھانجے تھے، ان کی ہندی شاعری کا بڑے بڑے عالموں اور شاعروں نے لوہا مانا ہے، اسی طرح میر عبدالجلیل کے پوتے سید برکت اللہ پیمی ہندی کے بلند مرتبہ شاعر تھے، ان کی کتاب "پیمی پرکاش" مشہور ہے۔

ابراہیم رسکھان ہندی کے علماء شعراء میں اتنا بلند پایہ شاعر گزرا ہو کہ اسکے دوہے ہندو مذہب کے لوگ پوجا کے وقت پڑھتے ہیں۔

مسلمان خواتین نے بھی ہندی زبان و ادب سے بہت دلچسپی لی سترھویں صدی کے اوائل میں تاج نامی ایک خاتون ہندی کی بلند مرتبہ شاعرہ گزری ہو جس کو اہل ہنود کے مذہبی رہنما کرشن جی سے بہت عقیدت تھی۔

سطور بالا میں مسلمانوں کی ان خدمات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے جو انھوں نے ہندی زبان و ادب کی ترقی کے سلسلہ میں انجام دی ہیں۔ لیکن یہ موضوع بہت وسیع ہے اور تمام شعراء کا تذکرہ اس اجمالی مضمون میں نہیں کیا

جا سکتا، آئندہ ہندی کے مسلمان شعراء کے کلام کا ایک مختصر انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ہند قدیم اور عرب میں علمی روابط

ہندستان اور عرب دنیا کے قدیم ترین ملک ہیں جو متعدد تہذیبوں کے مرکز رہے ہیں، علوم وفنون کی ترویج واشاعت میں ہندستان کی اولیت اور قدامت مسلّم ہے، ان دونوں ملکوں کے قدیم روابط کے متعلق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ ان کی ابتدار تجارتی تعلقات سے ہوئی۔ ان تجارتی تعلقات کا تفصیلی حال اس وقت سے معلوم ہوتا ہے جب سے عرب کے مسلمان تاجروں اور جہازرانوں نے ہندستانی ساحلوں پر آنا شروع کیا، عرب اور ہندستان کے تجارتی تعلقات کے ساتھ ساتھ علمی روابط کی بنیاد پڑی۔

عرب میں خلفاء عباسیہ کا دور علوم وفنون کی ترقی کا ایک سنہرا دور تھا، اس دور میں دنیا کے مختلف علوم وفنون کی تحصیل کا اہل عرب کو بہت شوق پیدا ہوا اور اس زمانہ کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا گیا، یہ سلسلہ تو پہلی صدی ہجری کے آخر میں شروع ہو گیا تھا مگر ہندستانی علوم کی طرف عباسی خلفاء نے خاص توجہ کی اور ان کی کوششوں سے ہندستان اور عرب میں علمی واخلاقی روابط کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

عباسی خلیفہ منصور کے پاس ۷۷۱ھ میں ہندستان کے علماء کا ایک وفد پہنچا جس کی قیادت ریاضی اور ہیئت کا ایک بہت بڑا ماہر پنڈت کر رہا تھا، وہ اپنے ساتھ سنسکرت کی مشہور کتاب "سدھانت" بھی لے گیا تھا۔ منصور نے وفد کی بڑی آؤ بھگت کی اور سرکاری طور پر ان کی رہائش کا انتظام کیا اور ایک عرب عالم ابراہیم فزاری کو مقرر کیا کہ وہ پنڈت کی مدد سے "سدھانت" کا عربی میں ترجمہ کرائے۔ یہ کام بڑی خوبی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہونچا اور اس طرح عربوں کو موقع ملا کہ وہ ہندستانی علوم و ادبیات سے واقفیت حاصل کریں، اب یہ سلسلہ مستقل طور پر جاری ہو گیا اور طب، ریاضی، نجوم اور اخلاقیات کی بہت سی سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو گیا، خلفائے عباسیہ اور برامکی وزیروں کی دریادلی کے باعث ہندستان کے صدہا پنڈت بغداد پہنچ گئے اور دربار خلافت نے ان کی پوری قدر افزائی کی اور بیش قیمت انعامات سے سرفراز کیا۔

ایران کے برمکی خاندان کو خلافت عباسیہ میں بڑا عروج و اقتدار حاصل تھا۔ پہلے عباسی خلیفہ سفاح کے زمانہ ہی سے برامکہ کا عروج شروع ہوا اور ہارون الرشید کے زمانہ میں ان کے اقبال کا ستارہ نصف النہار پر آگیا۔ وزارت مستقل برامکہ کے ہاتھ میں رہی، یہ خاندان علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا، ساتھ ہی اس نے علوم و فنون کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔ ہندستانی علوم و فنون کی کتابوں کے عربی میں ترجمے اسی کی کوششوں سے ہوئے، بعض مؤرخین کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ برامکہ نسلاً ہندستانی اور مذہباً بودھ تھے اور ایران کے شہر بلخ میں ان کا عبادت خانہ "نوبہار" کے نام سے مشہور تھا جس کی شکل بودھ عبادت گاہوں کے طرز کی تھی، لفظ "برمک"

بھی سنسکرت لفظ ہے جس میں معمولی تبدیلی ہو گئی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے عرب و ہند کے تعلقات پر جو لکچر ہندوستانی اکاڈمی میں دئے تھے ان میں بڑے وثوق کے ساتھ انھوں نے دعویٰ کیا ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ برامکہ ہندی الاصل تھے۔

ہندستان کا ایک ماہر طبیب منکہ نامی (سید سلیمان ندوی کے خیال میں یہ اصل میں مانک ہو) ہارون الرشید کے عہد میں سنسکرت کتابوں کا عربی ترجمہ کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا۔ تاریخ الاطبا میں ابن ابی صیبعہ نے لکھا ہو کہ خلیفہ ہارون ایک بار سخت بیمار ہوا اور کسی کے علاج سے افاقہ نہ ہوا تو کسی نے ہندستان کے اس مشہور طبیب مانک کا ذکر کیا۔ ہارون نے سفر خرچ بھیجکر بلوایا اور اسکے علاج سے صحت یاب بھی ہو گیا، پھر اس کو اپنے دار الترجمہ میں سنسکرت کتابوں کے عربی ترجمہ کے لئے مقرر کر دیا۔

اہل عرب نے ایک سے لے کر نو تک ہندسہ لکھنا بھی ہندستان سے سیکھا جیسا کہ بہار الدین عاملی نے اپنی کتاب "خلاصۃ الحساب" میں لکھا ہے اور دیگر کتب میں بھی اس کا ذکر صراحتاً موجود ہے ("خلاصۃ الحساب" کا میرے پاس کلکتہ کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے جو ٹائپ میں سنہ ۱۸۳۶ء میں چھپا تھا) اس کے علاوہ "سدھانت" کا ترجمہ بھی عربی میں ہو چکا تھا، اس میں حساب پر بھی دو باب موجود تھے، اس لئے عربوں نے ہندسہ لکھنا غالباً اسی سے سیکھ لیا ہو گا، یہی سبب ہے کہ عربی کے ہندسے جو اب اردو میں بھی رائج ہیں لکھتے وقت بائیں طرف سے شروع ہوتے ہیں، کیونکہ سنسکرت بائیں سے دائیں طرف لکھی جاتی ہے اور عربی دائیں سے بائیں طرف۔

مشہور عرب منجم اور طبیب الخوارزمی نے ان ہندسوں کی شکلیں کچھ درست کیں اور عربوں کے ذریعہ یہ یورپ میں بھی پھیلیں۔

اسی طرح ہندستان کے پنڈت علم نجوم اور ہیئت میں بہت ماہر تھے اور ان علوم پر متعدد کتابیں بھی سنسکرت میں تصنیف ہو چکی تھیں، عرب علماء نے عہد عباسیہ میں ایسی متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ان میں قابل ذکر کتابیں "برہمپ سدھانت" اور آریہ بھٹ کی کتاب "کھنڈ کھڈ یک" ہیں۔

سندھ کا جو پنڈت ۱۵۴ھ میں بغداد گیا تھا اور اس نے خلیفہ کے حکم سے "سدھانت" کا عربی میں ترجمہ کیا تھا اسکی شاگردی عرب کے دو عالموں نے اختیار کی تھی۔ ایک ابراہیم فزاری تھا اور دوسرا یعقوب بن طارق۔ اور ان دونوں نے "سدھانت" کے الگ الگ ترجمے کئے، اس کے بعد متعدد عرب علماء نے اس کتاب کی شرحیں لکھیں ان کی صحت کی کوششوں میں وقت صرف کیا۔ حسن بن صباح بانیِ فرقہ باطنیہ، فضل بن حاتم، ابوریحان بیرونی وغیرہ نے "سدھانت" پر کافی تحقیقی کام کیا، عربوں ہی کے ذریعے سے ہندستانی علوم اسپین پہونچے اور وہاں سے یورپ میں پھیلے۔

جب عربوں کو علم طب کی تحصیل کا شوق دامنگیر ہوا تو انھوں نے یونانی کتابوں کے عربی میں ترجمے کرائے۔ یہ سلسلہ عہد بنی امیہ میں شروع ہو چکا تھا مگر عہد عباسیہ میں اسکو ترقی ہوئی، ہارون الرشید کے زمانہ میں اس کے علاج کے لئے مانک نامی پنڈت کا تذکرہ ہو چکا ہے، جب وہ بغداد آیا تو ہندوستانی علم طب کا چرچا عام طور پر شروع ہو گیا اور ہندستان کے بہت سے وید بلا کر اس کام میں لگائے گئے، اس طرح تمام اہم طبی کتابیں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہو گئیں۔ ہندستانی طب کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ خاندان

برامکہ نے اپنے اسپتال کا منصب اعلیٰ ایک ہندوستانی وید کے سپرد کیا تھا، یحییٰ بن خالد برمکی نے ہندوستان آدمی بھیجے اور یہاں کی جڑی بوٹیاں منگوائیں اور انکی کاشت کا بھی انتظام کیا۔ یہ سلسلہ بعد میں عرصہ دراز تک جاری یحییٰ بن خالد برمکی کے حکم سے انکہ وید نے سنسکرت سے سُشرت کی مشہور کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا، یہ اسباب و علامات اور علاج امراض پر ایک جامع کتاب ہے، اسی طرح چرک نامی ایک مشہور وید کی کتاب کا اسی زمانہ میں عربی ترجمہ مکمل ہوا، اسی سلسلہ میں تقریباً دو درجن طب کی کتابوں کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوا۔ علم رمل، نجوم اور جادو منتر کی متعدد کتابوں کے سنسکرت سے عربی میں ترجمے ہوئے اور اس طرح اہل عرب کو ہندستانی علوم سے واقفیت کا اچھا خاصا موقع ملا۔

زمانہ قدیم میں ہندستان کے اہل دانش نے اخلاقی باتیں لکھانے کے لئے دلچسپ اور مؤثر انداز میں فرضی کہانیاں لکھی تھیں، یہ کہانیاں جانوروں اور پرندوں کی زبان سے ادا کی گئی تھیں، ان کہانیوں کی سب سے زیادہ مشہور کتاب پنچ تنتر ہے اور اس کے بعد ہتو اپدیش۔ "پنچ تنتر" کی کہانیوں کا ترجمہ پہلے فارسی زبان میں ہوا تھا، اس فارسی ترجمہ کی مدد سے دوسری صدی ہجری میں ابن مقفع نے عربی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام کلیلہ و دمنہ رکھا، یہ ترجمہ عربی میں بیحد مقبول ہوا اور اب تک اسکی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ مصر اور بیروت وغیرہ سے متعدد باتصویر اور خوبصورت ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں، یہ کتاب مدارس عربیہ کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ "پنچ تنتر" کے کئی ترجمے اور بھی عربی میں ہوئے، عہد عباسیہ میں دو شاعروں نے اس کا منظوم ترجمہ بھی کیا لیکن عبداللہ ابن مقفع کے ترجمہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور ترجمہ کو نہ ہو سکی اور اس ترجمے

دنیا کی دوسری زبانوں میں ان کہانیوں کے ترجمے ہوئے۔

عرب علماء کی ہندوستان میں آمد و رفت

جب اہل عرب کو ہندوستانی کتابوں کے ترجموں کے ذریعہ سے یہاں علوم و فنون سے واقفیت ہوئی تو ان کو اس بات کا شوق بھی دامنگیر ہوا کہ خود ہندوستان کی سیاحت کریں اور وہاں کے عالموں سے کچھ سیکھیں، اس شوق نے بہت سے عرب علماء اور سیاحوں کو ہندوستان پہونچایا، اس طرح باقاعدہ علمی سفارتوں کا سلسلہ قائم ہوا، ہندوستان کے پنڈت تو پہلے ہی عرب جا چکے تھے اب عرب علماء ہندوستان آنے لگے۔ چند ایسے عرب علماء اور سیاحوں کا مختصر تذکرہ آگے کی سطروں میں ملے گا۔

احمد بن یعقوب:۔ اس کا مشہور نام یعقوبی ہے۔ یہ ایک ماہر مورخ اور جغرافیہ داں تھا اور عباسی حکومت میں دفتر انشاء کا افسر اعلیٰ تھا، ہندوستانی علوم کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو ہندوستان کی سیاحت کا شوق ہوا اور وہ ہندوستان آیا، خوب گھوما پھرا اور یہاں کے حالات قلمبند کئے۔

سلیمان تاجر:۔ یہ ایک عرب تاجر تھا جو سیاح کی حیثیت سے بہت مشہور ہوا۔ وہ عرب سے چین تک سفر کرتا تھا۔ اس نے ہندوستان کے ساحلی مقامات کی خوب سیر کی تھی اور اپنے سفرنامہ میں جو ۲۳۷ھ ہجری میں لکھا تھا۔ ہندوستان کے بہت دلچسپ حالات لکھے ہیں اور اس بارے میں اس کو شرف اولیت حاصل ہے کہ بحیثیت عرب سیاح کے پہلی بار ہندوستان کے حالات تفصیل سے لکھے، عربوں نے اسکی کتاب کو بہت دلچسپی سے پڑھا۔

ابو زید حسن سیرافی:۔ عرب کا ایک مشہور عالم تھا، سیاحت کا بھی اس کو بہت شوق تھا خصوصاً ہندوستان آنے کی اس کو بڑی تمنا تھی۔ خلیج فارس کی بندرگاہ سیراف کا

باشندہ تھا، اس نے تجارتی سلسلہ میں ہندستان کی سیاحت کی اور یہاں کے علمی مرکزوں کا دورہ بھی کیا، اس نے سلیمان تاجر کے سفرنامہ کے پچیس برس بعد اپنا سفرنامہ ۲۶۴ھ ہجری میں لکھا، اس نے یہاں کے مذہبی حالات و معتقدات کے علاوہ علوم و فنون کا اچھی طرح سے تذکرہ کیا ہے۔

ابوالحسن علی مسعودی:- بہت مشہور جغرافیہ داں اور مورخ گزرا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس کو سیاحت کا بھی شوق تھا۔ ۲۵ برس تک مختلف ممالک کی سیاحت کی، بغداد کا رہنے والا تھا۔ ہندستان اور لنکا میں خوب پھرا اور یہاں کے تفصیلی حالات اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مروج الذہب" میں تفصیل سے لکھے ہیں، اس نے ہندستان کی متعدد زبانوں کا حال بھی لکھا ہے، اسکی سیاحت کا زمانہ ۳۰۳ھ ہجری اور اسکے بعد کا تھا۔

اصطخری:- پورا نام ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد ہے۔ بغداد کا رہنے والا تھا، بڑا عالم اور فاضل گزرا ہے۔ سیاحت کے شوق نے اس کو دنیا کا بڑا سیاح بنا دیا، اسکی کتاب "المسالک والممالک" بہت مشہور ہے اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ ہندستان کی سیاحت بھی اس نے کافی عرصہ تک کی، اس نے ہندستان کا سفر ۹۵۱ء میں کیا تھا۔

ابن حوقل:- یہ بغداد کا ایک زبردست عالم تھا، تجارت کا شوق تھا، اس سلسلہ سے دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کرتا تھا، ۹۴۳ء میں اس نے بغداد سے سفر کا آغاز کیا، یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں میں پھرتا رہا، اس سلسلہ سے ہندستان بھی پہونچا، اسی نے سب سے پہلے اپنے سفرنامہ میں ہندستان کی لمبائی

پیمائش کا اندازہ تحریر کیا ہے۔ اگرچہ وہ درست نہیں تاہم اس حیثیت سے قابل قدر ہے کہ ہمارے ملک کی پیمائش کی یہ اولین کوشش ہے۔

ان کے علاوہ بزرگ بن شہریار (۳۰۰ ہجری) ابو دلف سعر بن مہلہل (۳۳۱ ہجری)، شمس الدین بشاری المقدسی (۳۷۵ ہجری) اور چند دوسرے سیاحوں نے بھی ہندستان کی سیاحت کی اور یہاں کے حالات تفصیل سے لکھے۔ یہ سب دراصل سیاح ہی نہ تھے بلکہ ان میں سے بعض نے محض ہندوستانی علوم و فنون کی تحصیل اور یہاں کی تہذیب و تمدن کی تحقیق کے لئے دشوار گزار سفر اختیار کئے تھے جیسا کہ ان کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے، اس سلسلے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس کا زمانہ بہت بعد کا ہے یعنی ۱۳۷۷ء میں اس نے سیاحت کی تھی اور اس سے پہلے ہندوستان و عرب میں باقاعدہ علمی تعلقات قائم ہو چکے تھے اور علماء کی سفارتوں کا تبادلہ شروع ہو چکا تھا۔

البیرونی:۔ ہندستان اور عرب کے علمی روابط کے قیام و استحکام میں سب سے زیادہ خدمات مشہور عالم اور سیاح ابو ریحان البیرونی نے انجام دی تھیں، اس نے عرب و ہندوستان کے درمیان علمی، ادبی اور سماجی تعلقات پیدا کرنے کی بہت کوشش کی اور اپنی زندگی تقریباً اسی مقصد کے لئے وقف کر دی۔ ابو ریحان خوارزم کا رہنے والا تھا، علم نجوم اور طب اور اسلامی علوم پر اسکی گہری نظر تھی۔ البیرونی کو بعض ہندستانی علوم کی تحصیل کا شوق ہوا اور اس نے دشوار گزار راستوں کو طے کر کے اپنا عیش و آرام چھوڑ کر ہندستان کا رخ کیا۔ اس سے قبل وہ سنسکرت کتابوں کے عربی ترجمے پڑھ چکا تھا۔ ہندستان پہنچ کر اس نے سب سے پہلے سنسکرت زبان سیکھی اور اس میں

کافی مہارت پیدا کی۔ پھر تمام علوم کی بلند پایہ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس نے بہت عرصہ تک ہندوستان میں قیام کیا۔ بعض مؤرخین نے تو اسکی مدت قیام چالیس سال لکھی ہو، مگر تحقیق سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس کا زمانہ قیام وہ تھا محمود غزنوی کے حملے ہندوستان پر جاری تھے۔ بیرونی نے ہندوستان کے ایک بڑی ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام کتاب الہند ہے۔

البیرونی پہلا شخص ہے جس نے ہندوستانیوں کے لئے عربی کتابوں کے ترجمے سنسکرت میں کئے۔ اسی طرح عربوں کے لئے سنسکرت کی متعدد کتابوں کے عربی میں ترجمے کئے۔ یہ کام بہت ضروری اور اہم تھا البیرونی نے تنہا اس کو انجام دینے کی کوشش کی اور اہل ہند اور اہل عرب نے ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب ہونے کا سامان فراہم کیا جو کام حکومتیں اس دور میں پورے محکمہ کے ذریعے سے کرتی ہیں البیرونی جیسے مایۂ ناز عالم نے تن تنہا اس کو بحسن وخوبی انجام دیا۔

یہ بھی حقیقت ہو کہ یورپ والوں نے ہندستانی علوم سے واقفیت عربوں کے ذریعہ حاصل کی اور یہاں کے علوم انھیں کے توسط سے سب سے پہلے یورپ میں پہونچے، قرون وسطی میں ہندستانی تہذیب کے مصنف نے انسائیکلوپیڈیا آف برٹانکا کے حوالے سے لکھا ہے کہ:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے موجودہ فن عدد کی تخلیق ہندستان میں ہوئی ہے، غالباً علم نجوم کے ان نقشوں کے ساتھ جنھیں ایک ہندستانی سفیر ۷۷۳ء میں بغداد لایا تھا یہ اعداد عرب میں داخل ہوئے بعد ازاں عیسیٰ کی نویں صدی کے آغاز میں مشہور عالم ابو جعفر محمد الخوارزمی نے عربوں میں

"طرز کی تشریح کی اور اس سلسلہ سے اس کا رواج بڑھنے لگا۔ یورپ میں یہ مکمل اعداد مع صفر عیسیٰ کی بارھویں صدی میں رائج ہوئے"۔

("قرون وسطی میں ہندستانی تہذیب"، صفحہ ۱۳۶، مطبوعہ ہندستانی اکاڈیمی الہ آباد)

اسی طرح اینشنٹ ہندو میڈیسن کے مصنف نے لکھا ہے۔

"ہارون الرشید نے کئی ہندوستانی حکیموں کو بغداد بلایا تھا، عرب سے یورپ میں یہ علم پہنچا، اس میں قیل وقال کی گنجائش نہیں"۔

(اینشنٹ ہندو میڈیسن صفحہ ۱۵۲)

غرض عرب وہند کے علمی اور ثقافتی روابط بہت قدیم ہیں۔ ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں بھی یہ تعلقات قائم رہے اور ان میں اضافہ ہوتا رہا، البتہ ہندستان پر انگریزی تسلط نے دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک ان قدیم تعلقات کا رشتہ قریب قریب منقطع ہی کر دیا، لیکن ہندستان آزاد ہوا تو یہاں کی قومی حکومت نے عرب کے تمام عرب ممالک سے نہایت فراخ دلی کے ساتھ علمی، ادبی اور ثقافتی روابط کی تجدید کا سلسلہ شروع کیا اور اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہندستان کے علماء اور طلباء عرب ممالک میں بکثرت جاتے ہیں اور عرب علماء اور طلباء کی آمد و رفت بھی جاری ہے۔

قدیم ہندستان اور ایران میں تہذیبی اور سیاسی روابط

فردوسی اور فرشتہ کی نظر میں

ہندستان اور ایران کے تہذیبی اور سیاسی تعلقات بہت قدیم ہیں اور اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ آریوں اور ایرانیوں میں نہ صرف نسلی تعلق تھا بلکہ مذہبی اور لسانی اعتبار سے بھی ان میں قریبی تعلق رہا ہے۔ ''دبستان مذاہب'' کے مصنف نے ایران اور ہندستان کے مذہبی اور لسانی تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ کی مستند کتابوں میں بھی ان تعلقات کا تفصیلی ذکر ملتا ہے لیکن مستند تاریخی حقائق سے قطع نظر کرکے ہمارے پاس بعض ایسے ذرائع بھی ہیں جس سے ہندستان اور ایران کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے اور ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جن کو تاریخی کتابیں تو محفوظ نہیں کر سکی ہیں لیکن قرائن سے ان کو کسی حد تک باور کرنا ہی پڑتا ہے۔

ہمارے پیش نظر ایران کے شہرۂ آفاق شاعر فردوسی طوسی کا ''شاہ نامہ'' ہے

شاہ نامہ کی تاریخی اور نیم تاریخی حیثیت پر محققین نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس کے ماخذوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، تاہم اتنا مسلّم ہے کہ شاہ نامہ کوئی مستند تاریخ نہیں ہے اور فردوسی نے جو واقعات نظم کئے ہیں وہ ان لوگوں سے سن کر یا پوچھ کر جو پرانے حالات اور افسانے زبانی یاد رکھتے اور سناتے تھے۔ ایسے مخصوص لوگوں کا ایک گروہ ایران میں وہاں کی روایات کے مطابق شاہ نامہ کی تصنیف کے وقت موجود تھا۔

بہرحال فردوسی نے شاہ نامہ میں ہندستان اور ایران کے حکمرانوں اور بہادروں کے حالات، اور دونوں ملکوں کے تعلقات پر بہت سے اشعار میں روشنی ڈالی ہے اور بعض ایسی باتوں سے باخبر کیا ہے جن کے متعلق تاریخ خاموش ہے، اگر محققین و مؤرخین فردوسی کے بیانات کی روشنی میں تاریخ کی درمیانی گمشدہ کڑیوں کو ملانے کی کوشش کریں تو شاید دنیا کے سامنے بعض نئی تاریخی حقیقتیں جلوہ گر ہوں گی، واقعہ تو یہ ہے کہ فردوسی کی لکھی ہوئی بہت سی چیزیں تاریخی کسوٹی پر پوری اتر چکی ہیں۔ کیا تعجب کہ زال و رستم کے ان تعلقات اور واقعات کا استناد بھی حاصل ہو جائے جو قدیم ہندستان کے ساتھ فردوسی نے ظاہر کئے ہیں۔

فردوسی نے شاہ نامہ میں شنگل ہندی کا ذکر کیا ہے۔ شنگل نیپال اور تبت کے راستہ سے خاقان چین کے ہمراہ افراسیاب بادشاہ توران کی مدد کے لئے وہاں پہنچا، ان لوگوں کے ساتھ چین تبت اور ترکستان کی فوجیں تھیں جنھوں نے کوہ ہندوکش کو عبور کر کے خراسان (موجودہ افغانستان جو ایران کا صوبہ تھا) پر حملہ کیا۔ خود افراسیاب اس حملہ کے وقت ان فوجوں کے ساتھ نہ تھا۔ لیکن اس کا وزیر اعظم پیران ویشہ موجود تھا، ایرانیوں کی طرف سے رستم نے ان کا مقابلہ کیا، دو مشہور سردار کاموس اور اشکبوس رستم کے ہاتھ سے مارے گئے

تو پیران ویسہ نے رستم سے صلح کر کے لڑائی ختم کر دینے کا قصد کیا، اس وقت شنگل نے پیران ویسہ سے جو کچھ کہا اس کو فردوسی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

چنیں گفت شنگل کہ اے سرفراز | چہ باید شنیدن سخن ہا دراز
بیاری افراسیاب آمدیم | ز دشت و ز دریائے آب آمدیم
بسے بارہ دہ ہدیہ ہا یافتیم | ز ہر کشورے تیز بشتافتیم
چو شیر آمدیم و چو روبہ شویم | ز پیکار از دست کوتہ شویم
بیک مرد سگزی کہ آمد بجنگ | چرا شد چنیں بر شما کار تنگ

شنگل کی اس تحریک پر صلح کی تجویز ملتوی ہوئی اور شنگل نے رستم سے لڑنے کا ارادہ کیا۔ میدان میں نکل کر اس نے رستم کو اس طرح للکارا:-

برآمد اسپ تا جائے گاہ نبرد | در آمد بمیدان و آواز کرد
کو آں جنگجو مرد سگزی کجاست | ہمانا گرہ آید بجنگم رواست
چو آواز شنگل برستم رسید | ز لشکر نگہ کرد و او را بدید

رستم شنگل کی آواز سن کر مقابلہ کے لئے نکلتا ہے:-

بر شنگل آمد باواز گفت | کہ اے بد نژاد و فرومایہ جفت
مرا نام رستم کند زال زر | تو سگزی چرا خوانی اے بد گہر
نگہ کن کہ سگزی کنوں مرگ تست | کفن بیگماں جوشن و ترگ تست

فردوسی کے بیان کے مطابق شنگل بار بار رستم کو مرد سگزی (پہاڑی) کہتا تھا کیونکہ رستم سگستان یا سگزستان کا رہنے والا تھا لیکن خود کو سگزی کہلانا پسند نہ کرتا تھا بلکہ اس نام سے اپنی توہین محسوس کرتا تھا، رستم جمشید کی نسل سے اور سیستان کے

لوگ انکی رعایا تھے، اس لئے وہ اپنے کو رعایا کی اولاد کہلانا اپنی توہین سمجھتا تھا

رستم اور افراسیاب کی جنگ کے سلسلہ میں ابھی اشکبوس نامی سردار کا ذکر آیا ہے، یہ سردار راجہ کنشک کی فوج کا افسر تھا۔ سلطنت کشان ہندوستان کے بڑے حصہ میں عرصہ تک قائم رہی، خصوصاً شمالی ہندستان پر اس کا اقتدار مسلّم تھا اسکے علاوہ کشمیر سے بلخ تک یہ حکومت پھیلی ہوئی تھی، مشہور مؤرخ اور جغرافیہ نویس المسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھا ہے کہ ترکوں کی ایک قوم کا نام کشنک تھا، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہی کشان قوم مراد ہے جس کا ایک مشہور راجہ کنشک تھا اور جس کی حکومت حضرت مسیحؑ سے ڈیڑھ سو سال قبل قائم ہوئی تھی، راجہ کنشک کا دارالحکومت پشاور تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجہ کنشک نے بھی افراسیاب کی مدد کے لئے کوئی فوج بھیجی تھی جس کا سپہ سالار اشکبوس تھا اور وہ رستم سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ لڑائی میں پہلے رستم نے ایک مشہور بہادر رہام کو اشکبوس سے لڑنے کے لئے بھیجا۔

برآویخت رہام با اشکبوس	برآمد زہر دو سپہ بوق وکوس
بگرز گراں دست برد اشکبوس	زمیں آہنیں شد سپہر آبنوس
بزد گرز بر ترگ رہام گرد	کلہ خود او گشت زاں زخم خورد
چو رہام گشت از کشانی ستوہ	بپیچید از ورد وشد سوئے کوہ

جب رستم نے دیکھا کہ رہام مغلوب ہو رہا ہے تو وہ خود اشکبوس کے مقابلہ کے لئے پیدل نکلا۔ اس حالت اور معرکہ کا حال فردوسی نے اس پُرجوش انداز میں لکھا ہے۔

خدنگ برآمد ویکاں چو آب	نہادہ بروچار پر عقاب

بمالید چاچی کماں را بدست | بجرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست | خروش از خم چرخ چاچی بخاست
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ | فلک گفت احسن ملک گفت زہ
کشانی ہم اندر زماں جاں داد | تو گفتی کہ او خود زما در نزاد

فردوسی کی اس داستان کے پردے پر یقیناً تاریخ کے حقائق کی کچھ چمک نظر آتی ہے کیونکہ دیگر قرائن کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سمرقند کے قریب اب تک "کش" کے نام سے ایک بستی آباد ہے جس کو عام طور پر شہر سبز بھی کہتے ہیں اور امیر تیمور گورگان کی جائے پیدائش بھی ہے کیا تعجب کہ اس آبادی کا تعلق بھی "کشان" قوم سے ہو۔

ہندستان اور ایران کے ان قدیم تعلقات پر فرشتہ اور دوسرے مؤرخین نے اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں فرشتہ کا یہ بیان بھی قابل ذکر ہے

"کیشو راج جو کشن کا پوتا تھا ہندستان کا بادشاہ ہوا، دکن کے زمینداروں نے اس سے بغاوت کی اور مقابلے کے لئے آمادہ ہوئے، کیشو نے اپنی قوت کم پاکر ایران کے بادشاہ منوچہر کو تحائف بھیجے اور مدد طلب کی، منوچہر نے سام بن نریمان کی قیادت میں فوج بھیجدی، کیشو نے اس فوج کا جالندھر (پنجاب) تک جاکر استقبال کیا اور اس کو لیکر دکن چلا۔ وہاں کے لوگ ڈر کر منتشر ہوگئے۔" (ترجمہ تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۶، ۲۷)

اس کے بعد فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب کیشو کے بعد اس کا بیٹا میسراے بادشاہ ہوا جو نہایت مدبر عالم اور عقلمند تھا، اس نے ایک بڑی غلطی کی۔ وہ یہ کہ جب سام بن نریمان مرگیا تو منوچہر کی سلطنت کمزور ہوگئی اور ایران کے قدیم دشمن افراسیاب نے جو موقع کا

منظر تھا ایران پر چڑھائی کردی اور فتح حاصل کرلی۔ اس وقت میسزرائے نے پنجاب پر چڑھائی کردی اور اس حصہ کو زال بن سام کے قبضہ سے نکال لیا اور بہت سے تحائف اور ایلچی افراسیاب کے پاس بھیجے۔ اس وقت سے کیقباد کے زمانہ تک پنجاب راجگان ہند کے تصرف میں رہا۔ لیکن جب رستم پہلوان اپنے باپ دادا کے منصب مقرر ہوا تو اس نے پنجاب پر حملہ کیا اور میسزرائے مقابلہ کی تاب نہ لاکر بھاگ گیا۔ رستم نے اسکی جگہ ایک ہندستانی سردار سورج کو حکمران بنا دیا۔ یہ بڑا زبردست راجہ تھا۔ اس نے اپنا دارالحکومت قنوج کو بنایا۔ راجہ ایران کے حکمراں کیقباد کا ہمعصر تھا، اسی لئے اس نے رستم کے ساتھ اپنی بھانجی کا عقد کردیا تھا۔ (تاریخ فرشتہ ص ۲۰ و ۲۰)

سورج کے بعد اس کا بیٹا بہراج راجہ ہوا، (جس نے بہرائچ آباد کیا) اس کو کیدار نامی ایک برہمن نے شکست دی اور حکومت کرنے لگا، اسی زمانہ میں کوچ بہار سے شنگل نامی ایک شورہ پشت نے کیدار برہمن کو شکست دی اور حکمران بن بیٹھا۔ (تاریخ فرشتہ ص ۳۱) یہ وہی شنگل ہے جس کا ذکر ہم رستم کی جنگ میں کر چکے ہیں۔

سکندر کے حملہ سے قبل ایران کے خاندان کیان کی سیادت ہندوستان پر مسلم ہے لیکن تاریخوں سے اس کا پتہ کم چلتا ہے کہ سکندر کے حملہ کے وقت ایران اور مغربی ہندستان کے تعلقات کس قسم کے تھے۔ آیا ہندستان کا کوئی حصہ ایرانی حکومت کے اثر میں تھا یا نہیں۔ مگر فردوسی نے اس وقت کے حالات لکھے ہیں جب دارا شکست کھا کر آوارہ پھر رہا تھا اور اس نے ہندستان کے ایک راجہ سے مدد مانگی تھی۔

چو یاور نبودش ز نزدیک و دور	یکے نامہ بنوشت نزدیک فور
پر از نالہ و زیر دستی و درد	نبیسے آفرین بر جہاں دار کرد

دگر گفت اے مہتر ہند داں | خردمند و دانا و روشن رواں
ہمانا کہ نزدِ تو آمد خبر | کہ ما را چہ آمد زاختر بسر
سکندر بیاورد لشکر ز روم | نہ بر ماند مارا نہ آباد بوم
نہ پیوند و فرزند و تخت و کلاہ | نہ دیہیم شاہی نہ گنج و سپاہ

جب سکندر کو خبر ملی کہ دارا نے فور ہندی (یعنی راجہ پورس) سے مدد طلب کی ہے تو وہ دارا کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مگر اتفاق سے اسی زمانہ میں دارا کو اس کے ہمراہی وزیروں نے قتل کر دیا۔ بہر حال سکندر نے جب ہندستان پر حملہ کیا تو ٹکسلا کے راجہ نے اس سے صلح کر لی اور اپنی فرمانبرداری کا یقین دلا دیا، مگر راجہ پورس (فور ہندی) نے جو دوآبہ جہلم و چناب کا ایک زبردست راجہ تھا، مقابلہ کی تیاری کی اور راجہ ٹکسلا کے برخلاف اطاعت گزاری سے انکار کر دیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورس یا فور اس راجہ کا خاندانی لقب تھا اور اس خاندان کا ہر راجہ پورس کہلاتا تھا، کیونکہ فردوسی نے لکھا ہے ع ہر آمد بر فور فوراں نژاد۔ اسی طرح ایک جگہ راجہ کی زبان سے یہ مصرع ادا ہوا ہے ع منم فور داز فور دارم نژاد۔ بہر حال راجہ پورس نے راجہ ٹکسلا کی طرح نہ تو بزدلی دکھائی نہ سکندر کی فتوحات سے مرعوب ہوا، جب سکندر نے اس کو لکھا کہ راجہ ٹکسلا کی طرح تم بھی اطاعت کر لو تو اس نے انکار کر دیا اور جواب دیا کہ راجہ ٹکسلا کی اطاعت نے تم کو مغرور کر دیا ہے، میری تعظیم تو شاہان کیانی بھی کرتے تھے فردوسی کے الفاظ میں پورس کا جواب سُنئے۔

منم فور داز فور دارم نژاد | کہ از قیصراں کس نکردیم یاد
بدانگہ کہ دارا مرا یار خواست | دل دبخت با او بے ندیدیم راست

ہمی زشد پیلاں فرستادمش | ہمدوں بیاری زباں دادمش
چو بر دست آں بندہ برگشتہ شد | ترا زہرۂ برندہ ترپاک شد
گر اورا ز دستور بدید رسید | چرا شد خسرو درسرت ناپدید

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ فورس نے دارا کی امداد کے لئے فوج اور ہاتھی روانہ کئے تھے مگر ان کے پہنچنے سے قبل ہی دارا اپنے دو وزیروں کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ اور وہ امدادی فوج راستہ سے واپس آ گئی۔ فردوسی نے اس کے بعد پورس اور سکندر کی جنگ کے حالات بیان کئے ہیں جن کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔

فردوسی نے شاہ نامہ میں رستم اور زال کے ہندستان آنے کا ایک ایسا واقعہ بھی لکھا ہے جو بیحد دلچسپ ہے لیکن تاریخی کتابیں اسکی تصدیق نہیں کرتی ہیں۔ یوں تو رستم کا پنجاب پر اقتدار اور جالندھر کو قرار دینے کا ذکر تفصیل کے ساتھ فرشتہ نے بھی کیا ہے لیکن جس واقعہ کو ہم شاہ نامہ سے نقل کر رہے ہیں، اسکی نوعیت ایسی ہے جس سے بعض اُن واقعات کی تنقیص ہوتی ہے جو فرشتہ نے لکھے ہیں۔ فردوسی کی داستان اس طرح ہے۔

جس زمانہ میں رستم کا باپ زال سیستان کا حکمران تھا اور رستم کا عالم شباب تھا قنوج کے راجہ نے زال کے پاس قاصد کے ذریعہ سے ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں ایک عجیب خوفناک بلا ظاہر ہوئی ہے جو آدمیوں اور جانوروں کو سانس کے زور سے کھینچ کر نگل جاتی ہے (غالباً بڑا اژدہا مراد ہے) آپ جلد یہاں تشریف لا کر اس کو ہلاک کر دیجئے ورنہ میرا ملک اس طرح ویران ہو جائے گا، ہندستان کا ایلچی دربار ایران میں پہنچا۔

در آمد خلاسے بدرگاہ شاہ | پرستندہ خسروے پیش گاہ

زمیں را ببوسید در پیش زال | چنیں گفت کے خسروا بے ہمال
کہ آید جہاندیدہ مردے زہند | بدست اندروں نامہ پر پند
بدو گفت دستاں بکشائے راہ | بیارش بدیں نامور بارگاہ
برشاہ زابل رہنے برکشاد | بیاید مرا در از میں بوسہ داد

خط کے مضمون سے متعلق چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اگر زانکہ نائی بریں رزم گاہ | زہندوستاں باج دیگر مخواہ
کہ بر جائے دیراں روا نیست باج | بہ ہندوستاں بر سر ایں ہست تاج

زال نے رستم کو بلا کر راجہ قنوج کا خط سنایا اور خود ہندوستان جانے کی خواہش ظاہر کی رستم نے کہا کہ آپ خطرہ کی جگہ جائیں اور میں یہاں آرام کروں، کیسے ہوسکتا ہے:

اوگرچہ دلیرے ونام آورے | بہاں پہلوانے وکند آورے
نہ زیبد ترا رزم باپشت کوز | تو پیری دگر من جوانم ہنوز

اس طرح دونوں میں بحث ہوتی رہی، ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ میں ہندوستان جاؤں لیکن آخر یہ طے پایا کہ دونوں جائیں، اس طرح زال اور رستم ہندوستان روانہ ہوئے۔ یہاں کے راجاؤں نے ان کا شاندار استقبال کیا اور قیمتی تحائف پیش کئے۔ دونوں قنوج پہونچے، اژدہے کا پتہ معلوم کیا اور رستم تنہا اس کے مقابلہ کے لئے جنگل گیا اور اژدہے کو قتل کر دیا۔ قنوج میں اسکی بڑی خوشیاں منائی گئیں، ان تقریبات میں رستم کی نگاہ اچانک راجہ قنوج کی لڑکی پر پڑگئی اور دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوگئے:

پس پردۂ شاہ ہندستاں | یکے دخترے بود بس دلستاں

برون آمد از پردہ آں پر خرد — کہ تا زال را با پسر منگرد
چو بر لشکر زال بکشاد چشم — برو رستمش ناگہ افتاد چشم

رستم نے زال سے خواہش ظاہر کی کہ راجہ کی بیٹی سے اسکی شادی کرادی جائے۔ زال نے راجہ کو پیغام دیا اور اس نے خوشی سے منظور کرلیا۔

زگفتار او شادماں گشت رائے — بدو گفت برمن کرم از خدائے
کہ پشت کیاں رستمِ نامدار — زمن دخترم را بود خواستگار
اگر شوئی رستم شود دخترم — فروزاں شود بر سپہر اخترم

اس کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی اور رستم و زال سیستان واپس ہوئے قنوج کے اس راجہ کی بیٹی کے بطن سے فرامرز پیدا ہوا۔ فردوسی کی زبانی سنئے:

چنیں گفت گویندۂ ایں سخن — چو نہ ماہ بگذشت بر سیم تن
یکے پور زائید آں نوبہار — ببالا و چہرہ چو سام سوار
بسے شاد شد رستم پہلواں — بیامد رواں پیش آں دلستاں
چو فرزند را دید دل شاد گشت — ز درد و غمِ دہر آزاد گشت
مرا او را ببردند نزدیک زال — کہ تا بنگرد و بچہر بے ہمال
چو روے ورا دید دستان سام — مر او را فرامرز یل کرد نام

فردوسی کے انتقال کو ایک ہزار سال سے زیادہ زمانہ ہوچکا ہے، اس وقت اس کے سامنے کچھ قدیم نوشتے ہوں گے اور کچھ داستان سراؤں کے بیان کئے ہوئے حالات، جن کی بنیاد پر اس نے یہ داستان لکھی ہے۔ اس لئے اس کو یکسر غلط تو نہیں کہا جاسکتا، ہاں نوعیت کا فرق ضرور ہوسکتا ہے۔

رستم کے ہندستان آنے کا ذکر فرشتہ نے بھی کیا ہے، نہ صرف یہ بلکہ پنجاب کے ایک بڑے حصّہ پر عرصہ تک اس کی حکمرانی بھی ثابت ہوتی ہے۔ فرشتہ کے حوالے سے ہم نے سطور بالا میں بتایا ہے کہ سورج نامی راجہ رستم کی مدد سے حکمران ہوا تھا اور اس کا پایہ تخت قنوج تھا۔ یہ راجہ بادشاہ کیقباد کا معاصر تھا، اس نے اپنی بھانجی کی شادی رستم کے ساتھ کر دی تھی۔ رستم کا ہندستان کے ایک راجہ کی لڑکی یا بھانجی سے شادی کرنے کا ذکر فردوسی نے بھی کیا ہے۔ فردوسی نے قنوج کے راجہ شنگل کے متعلق لکھا ہے کہ وہ افراسیاب کی مدد کے لئے ایران گیا تھا اور رستم سے مقابلہ کیا تھا، مگر فرشتہ نے لکھا ہے کہ شنگل نے افراسیاب کو باج دینا بند کیا تو افراسیاب نے اسکی سرکوبی کے لئے پہلے پیران دیشہ کو بھیجا، پھر ایک بڑے لشکر کے ساتھ خود ہندستان آیا، شنگل کو شکست دی اور پھر اس کی جگہ دوسرا راجہ مقرر کر کے شنگل کو اسکی خواہش پر ایران لے گیا۔ غرض فردوسی اور فرشتہ کے بیانات میں یہ اختلافات ضرور پائے جاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں ہندستان اور ایران میں اس قسم کے کچھ نہ کچھ تعلقات ضرور تھے، اب ضرورت اس بات کی معلوم ہوتی ہے کہ مؤرخ ان بیانات کو تاریخی کسوٹی پر پرکھیں اور دیکھیں کہ ان میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے۔

اردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانیں

جب اُردو کی نثری داستانوں کا ذکر ہوتا ہے تو سب سے پہلے ذہن داستان امیر حمزہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، کیونکہ چند باکمال داستان نگاروں نے اس سلسلہ کو اتنا طویل بنا دیا کہ صرف مطبوعہ داستانوں کی تعداد نوے جلدوں سے زیادہ ہے۔ اس عظیم الشان داستان کا ایک سلسلہ طلسم ہوشربا نو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ اس سارے سلسلے کی روح ہے جس کو ہمہ گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی ہے، یہ سارا سلسلہ منشی احمد حسین قمر محمد حسین جاہ اور تصدق حسین لکھنوی کی محنت اور دماغی بلند پروازی کا نتیجہ ہے، یہ طویل اور خیالی داستانیں یا تو قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں، یا انتہائی روانی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں جنھیں زود نویس کاتبوں نے لکھا ہے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ فارسی داستانوں کا اُردو ترجمہ ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہاں فارسی زبان میں داستان امیر حمزہ کی چند جلدیں ضرور موجود ہیں جنھیں داستانوں کے اس طویل سلسلے کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے ایران سے بہت مدت گزری "رموز حمزہ" کے نام سے فارسی میں ایک داستان کئی جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے بھی یہاں کے داستان گو استفادہ کر سکتے تھے اور ممکن ہے کیا بھی ہو، لیکن کسی فارسی داستان کا مکمل ترجمہ اُردو کی ان داستانوں میں شامل ہوا یہ محتاج ثبوت ہے۔

مطبوعہ داستان امیر حمزہ کے متعدد سلسلے ہیں اور ان کے نام بھی الگ الگ ہیں ان میں کوئی بڑے سائز کے پانچ سو صفحات سے شاید ہی کم ہو اور بعض جلدیں ایک ایک ہزار صفحوں میں پوری ہوئی ہیں، چند کی ضخامت تو ڈیڑھ ہزار سے بھی متجاوز ہو گئی ہے۔ ان داستانوں کے متعلق اُردو کے بلند پایہ ادیبوں اور محققوں نے کافی چھان بین کی ہے۔ مفید مضامین شائع ہو چکے ہیں تاہم یہ عنوان ابھی تشنۂ تکمیل ہے اور تحقیق و تفتیش کے بہت سے گوشے باقی ہیں مجھے صرف بتانا ہے کہ داستانوں کی عام مقبولیت کے اس دور میں بہت سی اور داستانیں بھی تصنیف کی گئی تھیں جو شائع نہ ہو سکیں لیکن ان میں بعض اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث طلسم ہوش رُبا سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں اور ان میں زبان و بیان کی غیر معمولی دلکشی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ ایسی تمام داستانوں کا تذکرہ تو اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں، صرف لکھنؤ کے ایک باکمال داستان گو سید میرن آبرو کی تصنیف کی ہوئی داستانوں کا اجمالی تعارف کرانا مقصود ہے۔

میرن صاحب آبرو لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور محلہ مولوی گنج میں سکونت پذیر تھے۔ ان کے تفصیلی حالات اس وقت پیش نظر نہیں ہیں تاہم یہ بتانا ضروری ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع تھا، شہر کے اچھے داستان گو تھے اور جب طلسم ہوش ربا کی شہرت ہر طرف پھیلی تو ان کو بھی دلچسپ داستانیں لکھنے کا شوق دامنگیر ہوا، اس سلسلہ میں رؤسا اور والیان ملک کی طرف بھی ان کی نظر گئی، اور ایک داستان لکھ کر نواب صاحب بھاولپور کی خدمت میں بھی پیش کی، جس کا نام طلسم تحت الارض تھا۔ نواب بھاولپور کے یہاں سے یہ داستان بغرض طباعت و اشاعت لاہور کے ناشرین عبدالعزیز کے پاس گئی، چونکہ اس زمانہ میں مطبع منشی نول کشور داستانوں کی اشاعت میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا

اس لیے ناشرین مذکور نے مطبع نول کشور کی شاخ لاہور کو یہ داستان اشاعت کیلئے دے دی، وہاں سے لکھنؤ بھیجی گئی، میرن صاحب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے مالک مطبع سے درخواست کی کہ "طلسم تحت الارض" کی ابھی متعدد جلدیں اور میں نے لکھی ہیں ان کو بھی شائع کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی تصنیف کردہ اور زیر تصنیف داستانوں کی فہرست بھی ارسال کر دی اور اپنے خط میں ان کی تفصیلات بھی تحریر کی ہیں، معاوضہ کا تعین بھی کیا ہے، ان کا یہ خط میرے پاس محفوظ ہے، مطبع نول کشور کے محافظ خانہ میں میرن صاحب کی لکھی ہوئی داستانیں موجود ہیں اور بعض خراب و خستہ بھی ہو گئی ہیں۔ ان داستانوں کی اجمالی کیفیت سطور ذیل سے واضح ہو گی۔

(۱) "داستان معرکہ آرا"

یہ داستان دو جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد میں پچاس جزو ہیں، مصنف نے اس کا سلسلہ لعل نامہ دفتر ہشتم داستان امیر حمزہ سے اس طرح ملایا ہے کہ "جب بدیع الزماں نے دریائے جلیون کے قریب وفات پائی تو صاحبقراں فاتحہ چہلم سے فراغت پا کر کشتیاں طلب کرتے ہیں اور جب دریا جلیون عبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کشتیاں تباہ ہو جاتی ہیں، اور کرب کا ساتھ مع فرزندوں کے چھوٹ جاتا ہے اور یہ لوگ صحرائے کاج باج میں پہنچکر باجگیر سے جنگ کرتے ہیں"

مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "یہ داستان شاہ اکبر ثانی کے کتب خانے میں بہ زبان فارسی موجود ہے جس کو اکثر داستان گو جانتے ہیں"۔

(۲) اقبال نامہ غضنفری

اس کی چار جلدیں ہیں اور ہر جلد میں پچاس جزو ہیں، اس کو دفتر دہم قرار دیا ہے۔ اس کا سلسلہ دفتر نہم

معرکہ آرا سے ملتا ہے۔ یہ داستان بالکل نئی اور انوکھی ہے۔

(۳) توزک صاحبقرانی

چار جلدوں میں ہے اور ہر جلد پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا تعلق اقبال نامۂ غضنفری سے ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ یہ داستان اکبر بادشاہ کو بہت پسند ہے اور اس نے اسکو مرغوب سلطانی کا خطاب دیا تھا۔ اس میں صاحبقرانی کا فیصلہ ہے کہ بذریعہ امداد کے شہریار کجکلاہ کو ملتی ہے۔ مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ داستان امیر حمزہ کے پورے سلسلے میں اس سے زیادہ دلچسپ کوئی داستان نہیں ہے

(۴) طلسم دار الجنون

دو جلدوں اور ستر جزو پر مشتمل ہے۔ اس کا سلسلہ داستان داستان اقبال نامہ سے وابستہ ہے۔ اس میں سب سے زیادہ حیرت انگیز عیاریاں اور سحر کے کرشمے ہیں۔

(۵) طلسم آفت خیز

چار جلدیں، اور ہر جلد میں پچاس جزو ہیں۔ اس کی داستان توزک صاحبقرانی سے متعلق ہے۔ مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ طلسم ہوش ربا سے زیادہ دلچسپ اور دل کش ہے۔

(۶) طلسم کرشمہ گاہ جمشیدی

یہ طلسم چار جلدوں میں ہے اور اس کا تعلق توزک صاحبقرانی سے ہے اور مصنف داستان نے خود لکھا ہے کہ یہ داستان بھی اکبر بادشاہ نے فارسی میں تصنیف کرائی تھی۔

(۷) طلسم تحت الارض

یہ اس سلسلے سے علیحدہ ایک دلچسپ داستان ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اور کل ایک سو تین جزو میں ہے، اس کا سلسلہ طلسم زعفران زار سلیمانی سے ملایا ہے، اس کی

جلد اول نواب صاحب بھاول پور کو مصنف نے پیش کی تھی جو طباعت کی غرض سے مطبع منشی نول کشور میں بھیجدی گئی تھی۔ جب مصنف کو اس کا علم ہوا تو مطبع کے ارباب حل وعقد سے مشورہ کر کے اس کی بقیہ جلدیں بھی تیار کر کے مطبع کو دیدیں، لیکن تین جلدوں کے بعد غالباً یہ سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ کیونکہ مطبع نول کشور میں اس کی تین ہی جلدیں موجود ہیں۔

(۸) طلسم بزم آرائے سامری | دو جلدوں میں ہے اور ہر جلد میں پچاس جزو ہیں۔ یہ طلسم تحت الارض سے متعلق ہے، اس کا طلسم کشا سکندر فرخ لقا ہے۔

(۹) طلسم انجمن آرائے جمشیدی | یہ بھی دو جلدوں میں ہے اور ہر جلد میں پچاس جزو ہیں،

اس کا تعلق بھی طلسم تحت الارض سے ہے۔

(۱۰) طلسم نہ فلک | یہ دس جلدوں میں ہے اور ہر جلد میں پچاس جزو ہیں، مصنف نے دعوئ کیا ہے کہ یہ داستان تمام داستانوں کی جان ہے۔ اس کا سلسلہ سخن طلسم تحت الارض سے ملتا ہے، اس میں چودہ (۱۴) نقاب داروں کی جانبازیوں اور عیاریوں کا دلچسپ حال ہے، یہ طلسم بوستان خیال کے ڈھنگ پر ہے۔

(۱۱) دفتر اختتام داستان | چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد میں پچیس جزو ہیں۔ اس میں خاندان صاحبقران کے خاتمہ کا ذکر ہے اور دوسرے خاندان میں صاحبقرانی کے منتقل ہونے کا تذکرہ ہے

اس میں درد انگیز واقعات اور حالات ہیں، اس کا تعلق داستان امیر حمزہ کے بارھویں دفتر سے ہے۔

مذکورہ داستانوں کے علاوہ مصنف مذکور نے چند اور داستانوں کا ذکر کیا ہے جو معلوم نہیں کہاں ہیں، اسی کے ساتھ انکی ایک تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ابھی وہ بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے پروگرام کا مختصر خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

مختلف تحریروں میں جن غیر مطبوعہ داستانوں کا مصنف مذکور نے ذکر کیا ہے ان کے نام یہ ہیں :۔ "طلسم روح کش" ۔ "طلسم وادی السلاح" ۔ اور "طلسم محشرستان سامری"

ان میں سے کوئی داستان دو جلدوں سے کم میں نہیں تھی ۔ اگر یہ سب داستانیں شائع ہو جاتیں تو شاید دنیا کی کوئی زبان اُردو کے مقابلے میں اتنا بڑا ذخیرہ نہ پیش کر سکتی۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ داستان امیر حمزہ کے سلسلے کی تمام داستانیں اودھ کے باکمال داستان گوؤں نے پیش کی ہیں لیکن شرف اوّلیت اور غیر معمولی مشّاقی سے قطع نظر دلّی کے داستان گو بھی اس میدان میں اپنے جوہر دکھانے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن افسوس کہ انکی لکھی ہوئی دلچسپ داستانیں شائع نہیں ہوئی ہیں ۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ اور بہت طویل "داستان سامری نامہ" ہے جسے دہلی کے ایک باکمال داستان گو نے دس ضخیم جلدوں میں لکھا تھا، یہ غیر مطبوعہ داستان محفوظ ہو اس کے متعلق ایک تفصیلی مضمون علیحدہ پیش کیا گیا ہے۔

سامری نامہ

اُردو زبان و ادب کی ترقی میں داستان نگاروں کا ایک بڑا حصّہ ہے۔ اُردو کی نثری داستانوں کے عظیم الشان ذخیرے نے اُردو کو ایک امتیازی شان عطا کی ہے مطبوعہ داستانوں سے اہلِ ذوق عموماً واقف ہیں، لیکن غیر مطبوعہ داستانوں کی جستجو کم کی گئی۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب میں صرف ان غیر مطبوعہ داستانوں کا ذکر کیا ہے جو رام پور کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ اور چند داستانوں کے نام لکھے ہیں مگر ان کے متعلق موصوف کی معلومات ناقص ہیں۔ اس سلسلے میں آئندہ وضاحت کے ساتھ لکھوں گا۔

اس مضمون میں اُردو کی ایک بلند پایہ نثری داستان "سامری نامہ" کا تعارف مقصود ہے۔ سامری نامہ ایک بڑی داستان ہے جو دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، یہ داستان محمد جان مریخ دہلوی نے لکھی تھی، لکھنؤ کے داستان گو بہت شہرت حاصل کر چکے تھے خصوصاً طلسم ہوش رُبا کے مصنفین کا شہرہ جب عام ہوا تو دہلی کے داستان گو بھی اس میدان میں طبع آزمائی اور خامہ فرسائی کے جوہر دکھانے لگے، ان میں سے بعض نے اپنی خداداد ذہانت کے باعث طلسم ہوش رُبا کے مقابلے میں جو داستانیں لکھیں وہ بہت دلچسپ ہیں اور زبان و ادب کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ محمد جان مریخ دہلی کے

رہنے والے تھے، انھوں نے کانپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جہاں تک میں نے تحقیق کی یہ معلوم ہوا کہ قیام کانپور کا مقصد ہی یہ تھا کہ "سامری نامہ مکمل کریں کیونکہ اس کی طباعت واشاعت کے لئے انھوں نے مطبع منشی نول کشور کانپور سے معاملت طے کی تھی اور اس کے لئے ضروری تھا کہ اتنی بڑی داستان جہاں لکھی اور چھاپی جائے وہاں مصنف بھی موجود ہو۔ مطبع منشی نول کشور نے اس داستان کی طباعت واشاعت کی جد و جہد کی لیکن جلد اول کی طباعت کے دوران میں کچھ ایسے مواقع پیش آئے کہ کتابت کا سلسلہ تو جاری رہا لیکن طباعت کا کام بند ہو گیا اور بدقسمتی سے دوبارہ اس کی طباعت کا موقع بھی نہیں آیا۔ حالانکہ ۱۹۰۷ء کے بعد دوبارہ اسکی کتابت کرائی گئی اور مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کو کتابت کی صحت کے لئے مقرر کیا گیا انھوں نے کتابت شدہ تین جلدوں کی صحت نہایت محنت اور احتیاط کے ساتھ کی اور ہر صفحہ کی پشت پر دستخط بھی کر دیے اور اپنی ایک تحریر کے ذریعے سے صحت کتابت کی باقاعدہ توثیق بھی کر دی۔

سامری نامہ کی سات جلدیں تو محافظ خانہ مطبع منشی نول کشور میں محفوظ ہیں لیکن بقیہ جلدیں دیمک کی نذر ہو گئیں۔ مریخ نے جلد دوم کے بعد اندازہ لگایا تھا کہ انکی یہ داستان دس جلدوں میں مکمل ہو گی۔ اس لئے انھوں نے جلد سوم کے دیباچہ میں لکھا ہے :۔

> "بعد حمد خدا و نعت سرور انبیاءؐ یہ ہیچمداں محمد جان المتخلص بہ مریخ متوطن دہلی ساکن سال کانپور خدمت میں ناظرین والاتمکین کے عرض پرداز ہے کہ اس ناچیز نے بفضل الٰہی دو جلدیں سامری نامہ کی

ختم کر دیں اور اب تیسری جلد شروع کر دی ہے۔ جو انشاء اللہ دو مہینہ کے اندر
مطبع میں پہنچ جائیگی۔ اگر ناظرین نے قدر افزائی فرمائی تو انشاء اللہ
اس کا برابر سلسلہ جاری رہے گا اور یقین ہے کہ دس جلدوں تک نوبت
پہنچے گی۔" (دیباچہ جلد سوم صفحہ ۱)

"سامری نامہ" بہت دلچسپ داستان ہے، اسکی زبان صاف اور شگفتہ ہے غیر ضروری الفاظ کی بہتات نہیں ہے۔ انداز بیان بھی دلکش ہے۔ جا بجا اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ خود مرتب شاعر تھے اس لئے اپنے کلام کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ جلد دوم کے آغاز میں جو ساقی نامہ شامل کیا ہے اس کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

ساقی نامہ

کدھر ہے تو اے ساقیِ شوخ و شنگ — کہ درپیش ہے رند مشرب سے جنگ
تجھے اپنے جور و جفا کی قسم — تجھے اپنے ناز و ادا کی قسم
کیا صحبت غیر نے دل کو تنگ — لڑائی کی دل میں بھری ہے اُمنگ
یہ ہے التجا تجھ سے اے سرو ناز — کہ ہو بزم اور رزم میں امتیاز
مئے و جام و ساقی کا بھی ذکر ہو — کہ مستی میں بھی رنگ کی فکر ہو
امیر جہانگیر والا حشم — رہیں قید افسوں میں ثابت قدم

اس کے بعد داستان کا آغاز اس طرح کیا ہے:-

"نگارندۂ داستان جادوگری اور ناقلانِ افسانہ تھوڑی اس
رودادِ حیرت بیان کو کلک جادو رقم سے صفحۂ قرطاس پر یوں تحریر

فرماتے ہیں کہ جب ملک اخضر گرد پوش حیران و پریشان
کوہ مقناطیس سے شکست فاش کھا کر خدمت سامری میں
پہونچا اور اس نے از راہِ تالیف قلوب بہت کچھ تسلی و تشفی
کر کے رہنے کا انتظام کر دیا، اور وہ چار و ناچار زندگی کے
ناخوشگوار ایام بسر کرنے کو سامری کی امان میں رہنے لگا تو
جوش انتقام نے اس کے سینہ پُر کینہ کو آتش اشتعال سے
بھر دیا۔"

(ضمیمہ جلد دوم صفحہ ۲)

داستان امیر حمزہ کے سلسلے کی تمام داستانوں میں ایک ایک بات کو طول و طویل تمہیدوں اور لفظی گورکھ دھندوں میں اُلجھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن سامری نامہ میں عبارات کی سادگی خاص چیز ہے، ملاحظہ ہو:۔

"عیار کے قتل ہونے کی خبر پا کر سارا شہر اُمڈ آیا
تمام میدان تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا، پندرہ[15]
سولہ[16] جلاد چوڑے چوڑے تیغے کاندھوں پر رکھے ہوئے
ہیبت ناک انداز سے سولی کے چاروں طرف ٹہل رہے
تھے، شاہی سپاہی اسلحہ سے آراستہ انتظام کرتے
پھرتے تھے، ساحر سحر کی جھولیاں لٹکائے اپنی اپنی جگہ
بیٹھے اور کھڑے ہوئے ریفابیل عیار کا انتظار کر رہے تھے"۔

(سامری نامہ جلد دوم صفحہ ۵۵)

مذکورہ اقتباس بغیر مطالعہ و انتخاب ایک مقام سے نقل کردیا ہے۔
ساری داستان اسی انداز میں ہے۔ سامری نامہ کی ہر جلد تقریباً ایک ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اگر یہ داستان شائع ہوجاتی تو یقیناً اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوتا۔ لیکن موجودہ دور میں جب کہ اردو زبان ناسازگار حالات سے دوچار ہے اسکی توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ اتنی ضخیم داستان شائع ہوسکے لیکن یہ تو ہوسکتا ہے کہ ان کی خوشخط نقلیں کراکے بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ کردی جائیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں ان ادب پاروں کو دیکھ سکیں اور ادبی تحقیقات کرنے والے طلبا ان سے استفادہ کرسکیں، یہ کام اردو کے بڑے اور منظم ادارے ہی کرسکتے ہیں۔

اُردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانیں

"طلسم عجائب" اور "طلسم کُن فیکون"

اُردو کی نثری داستانوں میں "طلسم ہوش رُبا" کو جو شہرت اور قبولیت عام حاصل ہوئی اُس نے عام طور پر داستانیں پڑھنے اور لکھنے کا ذوق بڑھا دیا، "طلسم ہوش رُبا" "داستان امیر حمزہ" کے طویل سلسلہ کا ایک جزو ہے اور اس سارے سلسلہ کے مطبوعہ دفاتر کی تعداد اسّی سے زیادہ ہے، آج سے چالیس پچاس سال قبل تک داستانیں پڑھنے اور سُننے کا شوق عام تھا۔ اس میں خواص و عوام اور عالم و جاہل کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ پڑھے لکھے تو خود پڑھ لیتے تھے لیکن جہلاء کسی خاص مقام پر اکٹھا ہو کر کسی تعلیم یافتہ آدمی سے پڑھواتے تھے۔ شہروں کے علاوہ قصبات میں بھی یہ ذوق عام تھا، اکثر ساری رات بیت جاتی مگر سُننے والوں کی پلکیں نہیں جھپکتی تھیں، داستانوں میں عوام و خواص کی اتنی گہری دلچسپی دیکھ کر داستان گو بھی اپنے کمالات کے جوہر دکھانے میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے، اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس دور میں بیشمار داستانیں لکھی گئیں، ان میں بعض فنی اعتبار سے بہت بلند ہیں اور زبان و بیان

اور محاورات کے لحاظ سے قابل اعتنا سمجھی جاتی ہیں۔ جو داستانیں ذوق و شوق کے اس زمانہ میں شائع ہوگئیں ان سے اہل علم واقف ہیں۔ لیکن بہت سی بلند پایہ اور دلچسپ داستانیں منظر عام پر نہیں آسکیں اور باوجود اپنی فنی خوبیوں کے اہل ذوق کی نظروں سے پوشیدہ رہیں، یہ حقیقت ہے کہ داستانوں کے اعتبار سے دنیا کی شاید کوئی زبان اُردو کا مقابلہ کرنے کی جرات کر سکے۔

اس مضمون میں اہل ذوق کو اُردو کے ایک باکمال داستان گو اور اسکی دو داستانوں سے واقف کرانا مقصود ہے۔

سید عاشق حسین بزم ایک ماہر داستان گو تھے۔ ان کے تفصیلی حالات اس وقت پیش نظر نہیں ہیں، تاہم اتنا معلوم ہے کہ وہ منشی اسمٰعیل حسین منیر کے پوتے تھے اور ابتداء میں منشی امتیاز علی کاکوروی مرحوم وزیر اعظم ریاست بھوپال کے مصاحب رہے۔ پھر ریاست دھول پور کے جاگیردار نواب رستم علیخاں بہر کے پاس آگرہ چلے گئے۔ کچھ عرصہ حیدرآباد میں بھی رہے۔ ان کو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی، مرثیے بھی اچھے کہتے تھے۔ حیدرآباد میں ان کو اپنے مرثیوں کے باعث خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ حیدرآباد سے اپنے وطن آئے اور عرصہ تک گوشہ نشین رہے۔ پھر نواب حامد علی خاں بہادر والئی رامپور نے بلایا اور اپنا مصاحب خاص بنالیا، پانچ سال رامپور میں رہ کر وطن (انبیر) آئے اور اپنی داستانوں کو مکمل کیا۔ ان کی لکھی ہوئی داستانوں میں "طلسم عجائب" اور "طلسم کن فیکون" ہیں۔ آخر الذکر کے دیباچہ میں انھوں نے اس داستان کی تصنیف کا سبب لکھا ہے اور اجمالی تعارف کرایا ہے، جس سے بہت سی مفید باتوں کا علم ہوتا ہے۔ چند

اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں :-

"اگرچہ داستان گویان ماضی وحال نے صدہا طلسم تصنیف کئے ہیں اور اپنی لیاقت اور تحریر کا زور دکھا کر صاحبان علم وفن سے داد لی اور رؤسائے جلیل اور والیان ملک نے ان کی قدردانیاں مگر آج تک کسی نے اس اصلی طلسم کی طرف توجہ نہ کی جو حقیقی طلسم ہے۔ یعنی "دنیا" اور جس کا تحریر کرنا امر دشوار ہے سہل نہیں، واضح ہو کہ ہر طلسم کو ایک حکیم یا چند حکماء مل کر ترتیب دیتے ہیں اور ہر طلسم کی ایک یا دو لوحیں ہوتی ہیں جس کے ذریعہ سے طلسم کشا طلسم کو فتح کرتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہر طلسم کے ساکن جادوگر ابلیس پرست ہوا کرتے ہیں انھیں سے مقابلہ اور مجادلہ طلسم کشا کا ہوتا ہے اور وہی لوگ دھوکہ دے کر لوح لے جایا کرتے ہیں جس کے سبب سے طلسم کشا کو چند درچند آفتوں اور مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ پھر لوح کوشش سے عیاروں کے ہاتھ آتی ہے اور طلسم کشا بھی رہا ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ طلسم فتح ہوتا ہے اور ساکنان طلسم متابعت طلسم کشائی قبول کر کے اسلام اختیار کرتے ہیں اور ہر طلسم کا باطن اور ظاہر بھی ہوتا ہے۔

اب ملاحظہ کے قابل یہ امر ہے کہ دنیا بھی ایک طلسم ہے اور بانی اس طلسم عالم کا حکیم مطلق یعنی پروردگار ہے اور چونکہ طلسم کے واسطے شکست ہونا اس کا ایک وقت خاص میں ضروری ہے لہذا دنیا کے طلسم کے شکست ہونے کا بھی ایک وقت مقرر ہے، جس کا نام حشر ہے اور ہر طلسم کا طلسم کشا ایک ہوتا ہے۔ اس طلسم کے طلسم کشا تمام دنیا کے لوگ ہیں اور ہر شخص کا دل ایک لوح ہے

اور باطن اس طلسم ملک عدم ہے اور ظاہر اس طلسم کا عالم وجود ہے اور طلسم ظاہر میں آنے کا راستہ شکم مادر ہے اور طلسم باطن میں جانے کا راستہ دہان گور ہے اور طلسم ظاہر و باطن کے درمیان میں ایک مرحلۂ تاریک اور ہے جسے انسان نو ماہ میں طے کرتا ہے اور اس کے بعد ظاہر طلسم میں آتا ہے۔ اس مرحلۂ تاریک کا بیان ہی قابل دید ہوگا۔

طلسم ظاہر کے تین دربند ہیں۔ پہلا در عالم طفلی۔ دوسرا دربند عالم جوانی۔ تیسرا دربند عالم پیری۔ اور ان دربندوں کے متعلق بہت سے مرحلے اور رکھے ہیں۔ جن کے بیان سے سامعین اور ناظرین بہت محظوظ ہوں گے اور کمترین کی جانکاہی اور محنت کی داد دیں گے، اور ہر طلسم میں فاتح طلسم کی رہبر لوح ہوتی ہے جو راستہ بتاتی ہے۔ اسی طرح اس طلسم کی لوح انسان کا دل ہے جو ہر نیک و بد میں مشورہ دیتا ہے اور ہر طلسم میں مقابلہ اور مجادلہ جادوگروں سے ہوتا ہے۔ اس طلسم میں شیاطین سے مقابلہ ہے اور عیار انسان کی عقل ہے ......"

(ماخوذ از دیباچہ طلسم کُن فیکون" صفحات ۱-۴)

مذکورہ اقتباسات سے "طلسم کُن فیکون" کا اجمالی خاکہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ داستان بڑے سائز کی چار ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی۔ اب اس کی دو جلدیں محفوظ ہیں اور دو دیمک کی نذر ہو گئیں اور اس طرح کارآمد نہیں رہیں۔

طلسم عجائب: "یہ ایک دلچسپ داستان ہے جو بزم نے طلسم ہوشربا کے طرز پر لکھی تھی۔ اس دیباچہ میں انھوں نے سبب تصنیف پر

بھی روشنی ڈالی ہے۔ حمد و نعت کے بعد حضرت علیؓ کی منقبت میں اپنے جدامجد اور استاد منشی اسمٰعیل حسین صاحب منیرؔ کی ایک مختصر نظم لکھی ہے۔ اس کے بعد سبب تصنیف اس طرح بیان کیا ہے:۔

"جس زمانہ میں کہ میں ریاست بھوپال میں منشی امتیاز علی صاحب مرحوم وزیر اعظم کا مصاحب خاص تھا، اکثر صحبت مشاعرہ ہوا کرتی تھی۔ حسب اتفاق ایک دن بعد ختم مشاعرہ کچھ "طلسم ہوشربا" کا ذکر آگیا۔ میرے محب خالص، دوست بے ریا مخدومی جناب سراج میر خاں صاحب سحرؔ نے کہ جو نواسے نواب باقی محمد خاں صاحب مرحوم کے ہیں، مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بعد تحریر کرنے "طلسم ہوشربا" کے اگرچہ جناب منشی احمد حسین صاحب قمرؔ مرحوم داستان گو نے اور چند طلسم بھی مثل "طلسم نور افشاں" "طلسم ہفت پیکر" "طلسم خیال سکندری" وغیرہ ارقام فرمائے ہیں، لیکن اُن کو "ہوشربا" سے کچھ مناسبت نہیں۔ "ہوشربا" ہوشربا ہے۔ اس پایہ کا طلسم پھر ان مرحوم سے بھی نہیں لکھا گیا۔ چونکہ تو منشی اسمٰعیل حسین منیرؔ کا پوتا اور شاگرد رشید اور اُن کا جانشین کہلاتا ہے اور وہ مرحوم علاوہ اس کے کہ آسمان نظم کے آفتاب اور اپنے زمانے کے سخنوروں میں نامور اور لاجواب تھے داستان بھی بے مثل کہتے تھے اور طلسم بھی بے نظیر لکھتے تھے۔ چنانچہ "طلسم گوہر بار" اس امر کا شاہد ہے۔ علاوہ اس کے "طلسم طاؤس اشکبار" اور "طلسم ہفت کوہ سلیمانی" بھی انھیں مرحوم کی تیزیٔ طبع کی یادگار ہیں، مگر افسوس کہ طبع ہونے سے رہ گئے۔ اگر چھپ جاتے تو اہل نظر پر یہ بات روشن اور ثابت ہو جاتی کہ طلسمات

ان کو کہتے ہیں۔ پس اگر تو اس کام پر کمر باندھے اور کوئی طلسم لکھے تو کیا بعید ہے کہ سند قبولیت پا جائے اور زمانے کو پسند آجائے۔ میں نے ہر چند عذر کیا لیکن انھوں نے نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے اقرار کر لیا تھا کہ اگر خدا مہلت دیگا تو ضرور کچھ لکھوں گا۔"

اس کے بعد برہم نے اپنے حالات لکھے ہیں کہ وہ بھوپال سے نواب رستم علیخاں کے پاس آگرہ گئے۔ وہاں سے حیدرآباد، پھر آخر میں رامپور میں پانچ سال قیام کا تذکرہ کیا ہے اس میں برہم نے ان واقعات کو بنیاد بنایا ہے جن کی طرف قمر لکھنوی نے طلسم ہوشربا جلد پنجم حصہ دوم میں صرف اشارے کر دیے ہیں۔

داستان "طلسم عجائب" کا آغاز اس طرح ہوا ہے :-

"راویان شیریں گفتار اس طرح لکھتے ہیں کہ جس دن سے بادشاہ لشکر اسلام قباد شہریار ابن زلزلہ تحات ثانی سلیمان امیر حمزہ صاحبقراں زماں کا سر حکم سے زنشیرداں کے گلیم گوش عیار نے کاٹ لیا تھا جس کے غم میں صاحبقراں زماں فقیر ہو گئے تھے اور ملکہ مہرنگار مادر قباد نے زہر کا پیالہ پی کر جان دے دی تھی، پھر اُن کا مدت تک کچھ حال کسی نے نہیں لکھا تھا۔ اتفاق سے جب اسد نوجوان نبیرۂ صاحبقراں "طلسم ہوشربا فتح کرنے آئے تو حوالی طلسم صندل میں ایک صحرا کے اندر اپنے ماموں قباد شہریار سے ملے۔"

اس کے بعد مصنف نے اشارہ کیا ہے کہ ان واقعات کو قمر مرحوم نے "طلسم ہوشربا" جلد پنجم حصہ دوم میں بیان کیا ہے۔ یعنی ملکہ سنجاب کے قلعہ تک اسد نوجوان اور

خواجہ عمرو کا جانا اور ناکام لوٹنا" لیکن ملکۂ عجائب کا آئندہ حال کیا ہوا اور وہ خواجہ عمرو کے خوف سے شیر کو کہاں لیے پھرتی رہی، اس کو قمر مرحوم نے نہیں لکھا تھا۔ برزم نے اس واقعہ کو بڑی خوبی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے اور دلچسپ حالات بیان کیے ہیں، غرض کہ یہ داستان اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث بہت دلچسپ ہو زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بلند ہے۔

برزم نے ایک ناول بھی "وجود و عدم" کے نام سے لکھا ہے جس میں روح کے وجود کے اثبات کی کوشش کی ہے اور بڑے دلچسپ اور دلنشین پیرایہ بیان میں پیش کیا ہے۔ اس ناول کے دیباچہ کے حسب ذیل اقتباسات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر کس قسم کے مباحث ہیں:۔

"خداوند عالم نے قبل پیدائش جناب آدم علیہ السلام جس قدر روحوں کا عالم وجود میں لانا مقصود تھا یا جس قدر اسکی مشیت میں تھا سب ایک ہی مرتبہ پیدا کر دی تھیں۔ اب کوئی نئی روح نہیں پیدا کی جاتی۔ جن انھیں روحوں میں سے جس روح کو حکم ہوتا ہے وہ پیکر انسانی میں داخل ہو کر عالم وجود کی سیر کرتی ہے، ہر روح کی تقدیر جداگانہ اور مراتب جداگانہ ہیں۔ کوئی روح بادشاہ کے جسم میں آتی ہے اور کوئی فقیر کے جسم میں، کوئی کافر کے جسم میں آتی ہے کوئی مومن کے جسم میں۔ کوئی روح قادر لم یزل کی نافرمانی کرتی ہے اور کوئی فرمانبرداری، کوئی عیش میں رہتی ہے اور کوئی مصیبت میں، جس طرح کہ اس عالم میں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دراصل روح ہی کوئی چیز ہے اور جسم یعنی کالبد خاکی

کوئی چیز نہیں ہے اور سزا اور جزا اور راحت و تکلیف سب روح کے ہی واسطے ہے۔ اس وجہ سے کہ جب روح جسم سے مفارقت کر جاتی ہو پھر جسم بالکل بے کار اور معطّل ہو جاتا ہے۔ نہ آنکھ کوئی شے دیکھ سکتی ہو، نہ ناک کوئی شے سونگھ سکتی ہے، نہ کان کوئی بات سُن سکتے ہیں نہ ہاتھ پاؤں ہِل سکتے ہیں، اور جب تک روح جسم میں رہتی ہے یہ سب اعضاء کام ... ...

... ... خدا کی حکمتیں سمجھ میں نہیں آتیں کہ کیوں ہر روح کو مساوی نہ کر دینے سے انتظام عالم نہیں چل سکتا تھا۔ اس واسطے کہ جب سب یکساں امیر ہی ہوں یا فقیر ہی ہوں تو نہایت دقّت پیش آجائے۔ اس لئے قدرت نے متفرق درجے رکھے ہیں۔ ... ...

... ایک امر اور قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ایک روح ایک ایک امیر کے جسم میں آئی اور ایک فقیر کے جسم میں تو پہلی سے کیا کار نمایاں ہوا تھا جس کے سبب سے اسے یہ اعلیٰ درجہ دیا گیا اور دوسرے نے کیا خطا کی تھی کہ یہ ادنیٰ درجہ اُسے عطا ہوا۔ اس کا ظاہرا اور کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ صاحب قدرت ہے اسکی مصلحت اور مشیت میں جیسا کچھ گزرا اس نے ویسا کیا۔ اس معاملہ میں ہم کہ اس کے ایک ادنیٰ بندہ ناچیز ہیں، کوئی حرف سوائے تسلیم و رضا کے نہیں کہہ سکتے"

اس کے بعد ناول کا آغاز ہوتا ہے اور پہلے روحوں کی بات چیت ہی جو بہت دلچسپ انداز میں پیش کی ہے۔

اُردو ادب کی تاریخ میں یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ اس قسم کے بہت سے ادبی جواہر پارے تلف ہو گئے اور جو باقی ہیں ان کے تحفظ و بقا کے لئے بھی کوئی مناسب جد و جہد نہیں کی گئی، عام طور سے صرف ان چیزوں ہی پر توجہ کی جاتی ہے جو ہر طرح محفوظ ہیں یا شائع ہو چکی ہیں، ادیبوں اور محققوں کے ہاں چھان بین انھیں حدود میں اب بھی جاری ہے جن کے اندر بہت کچھ ہو چکا ہے، نثری داستانوں پر تحقیقی کام بھی ہوئے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مکمل ہیں یا ان پر غیر معمولی محنت و توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ابھی مجھے متعدد اچھی نثری داستانوں سے ادبی دنیا کو روشناس کرانا ہے۔ جن کا مواد میں نے اپنی نئی تالیف "اُردو کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نثری داستانیں" کے لئے یکجا کیا ہے۔

ان داستانوں میں کچھ ایسی بھی ہیں جو اُردو کے ممتاز ادیبوں کی لکھی ہوئی ہیں اور زبان و بیان کی شگفتگی اور روانی کے باعث ان کو ادبی شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ خصوصیت سے جناب آرزو لکھنوی کی تصنیف کی ہوئی ایک طویل داستان کا کسی علیحدہ مضمون میں ذکر کیا جائیگا، یہ داستان بھی آرزو صاحب نے مطبع منشی نول کشور کے لئے لکھی تھی۔

ایک باکمال مصنف و مترجم

مولانا سید امیر علی ملیح آبادی رحمۃ اللہ

مولانا سید امیر علیؒ ایک جامع الکمالات شخصیت کے حامل تھے، عربی زبان اور اسلامی علوم میں ان کا تبحر بے مثل تھا، اسی کے ساتھ اُردو زبان میں ان کی مہارت مُسلّم تھی، اسی لئے بحیثیت مترجم کے انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، وہ حیرت انگیز ہیں کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ عام معمولات کے ساتھ ساتھ انھوں نے ترجمہ کے سلسلہ میں ایسی زبردست خدمات تن تنہا کس طرح انجام دی ہیں، جن کیلئے ایک عظیم الشان دارالترجمہ قائم ہوتا تب بھی اتنا کام نہیں ہو سکتا تھا۔

اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں خصوصیت سے مولانا امیر علیؒ کی شخصیت روشنی کا مینار ہے۔ مگر افسوس کہ علمی دنیا نے ان کی قدر و منزلت سے تغافل برتا، ان کے کارناموں کی شہرت ان کے شایانِ شان نہ ہو سکی۔ عام طور سے ان کے علمی و ادبی شاہکاروں پر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

مولانا امیر علی مرحوم اودھ کے مشہور قصبہ ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق سادات کے ایک غریب خاندان سے تھا، ابتدائی تعلیم و تربیت اسی قصبہ میں

حاصل کی، اٹھارہ سال کی عمر تھی کہ ڈاک خانہ میں ملازمت مل گئی، غریبی تحصیل علم میں مانع تھی، اس لئے ملازمت کر لی اور بہرائچ میں تقرر ہوا۔ اس وقت تک صرف اُردو کی تعلیم حاصل کی تھی۔ عربی فارسی کی کوئی قابل ذکر تعلیم نہیں پائی تھی۔

ایک دن نماز کے لئے مسجد گئے تھے (غالباً ظہر کا وقت تھا) کہ اس درمیان ڈاک خانہ کا افسر اعلیٰ معائنہ کے لئے پہنچ گیا، کسی نے آپ کو دوڑ کر اطلاع کی مگر آپ اطمینان سے بعد فراغت نماز ڈاک خانہ پہونچے، افسر نے اعتراض کیا آپ نے استعفیٰ پیش کر دیا۔

اس واقعہ سے مولانا کے دل پر یہ اثر بھی ہوا کہ دین کی پابندی کے باعث ملازمت گئی اور حال یہ ہے کہ علوم دین سے مجھے بالکل واقفیت نہیں، یہاں تک کہ نماز کی دعاؤں کا مطلب بھی نہیں سمجھ پاتا ہوں۔ یہ خیال ایسا ذہن نشین ہوا کہ مولانا نے علم دین کی تحصیل کا مصمم ارادہ کر لیا اور آپ نے اس دور کے مشہور عالم مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی (ضلع اعظم گڈھ) کی خدمت میں پہونچے جن کے شاگردوں میں مولانا شبلی نعمانی بھی تھے، ان دنوں مولانا فاروق صاحب ہفتوں درس نہیں دیتے تھے۔ مولانا امیر علی صاحب کا جوش تحصیل علم اتنا بڑھا ہوا تھا کہ یہ انتظار کی گھڑیاں ان کے لئے مصیبت تھیں۔ مجبوراً لاہور کا رُخ کیا وہاں بھی اطمینان نہ ہوا تو دہلی چلے گئے، جہاں اس زمانہ میں مشہور محدث مولانا نذیر حسین صاحب کا فیض جاری تھا۔ یہاں مولانا امیر علی نے پہلے عربی ادب و قواعد اور دیگر ضروری علوم کی تحصیل بہت تھوڑی مدت میں

کرلی اور پھر درس حدیث میں شریک ہو گئے۔ ان دنوں مولانا عبدالحلیم صاحب شرر بھی ان کے ہم درس تھے۔

صرف چار سال کی قلیل مدت میں مولانا نے اسلامی علوم میں مہارت حاصل کرلی، عربی زبان پر عبور ہو گیا، اس کے بعد لکھنؤ واپس آگئے۔ مولانا کو ایک طرف علم حدیث سے بیحد شغف تھا۔ اسماء الرجال کے زبردست حافظ تھے، دوسری طرف تفسیر میں ان کی قابلیت مسلّم تھی۔

مطبع منشی نول کشور سے تعلق

مولانا جب دہلی سے لکھنؤ آئے تو یہاں منشی نول کشور کو مولانا کی قابلیت کا حال معلوم ہوا، منشی جی مردم شناس تھے اور اہل علم کی قدر و منزلت کرتے تھے، اس زمانہ میں ان کا مطبع شاہراہِ ترقی پر گامزن تھا اور وہ ایسے اہل علم کی تلاش میں رہتے تھے جو ضرورت زمانہ کے مطابق مختلف علوم و فنون کی کتابیں لکھیں یا ترجمہ کرسکیں۔ منشی نول کشور نے مولانا سے درخواست کی کہ ان کے مطبع میں کام کریں جسے مولانا نے منظور کرلیا۔ اور ایک قلیل مدت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن کی مثال میں صرف قرونِ وسطیٰ کے چند علماء کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

ابتدا میں مولانا مطبع کی عمارت میں بیٹھ کر کام کرتے تھے مگر منشی نول کشور نے محسوس کیا کہ آنے جانے میں مولانا کا وقت بہت صرف ہو جاتا ہے، اس لئے انھوں نے درخواست کی کہ آپ کام گھر ہی پر بیٹھ کر کیا کریں۔ مولانا نے منظور کرلیا۔ پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ مولانا کو حقہ نوشی کا بہت شوق تھا منشی نول کشور روزانہ ان کے لئے پینے کا تمبا کو بھیج دیتے تھے، کبھی کبھی خود اُن کے

مکان بھی جاتے تھے۔ جو کام روز مولانا کرتے تھے وہ منگوا لیتے تھے اور نیا کام خود ان کے پاس بھیج دیتے تھے۔

مولانا نے غیر معمولی محنت اور توجہ سے مطبع کا کام کیا اور اتنا زیادہ کہ ان کی صحت بگڑ گئی۔

سفر حجاز

مولانا نے کافی عرصہ تک مطبع نولکشور میں کام کیا ہندوستان کے عام حالات سے ان کی طبیعت مکدر رہتی تھی۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا ان پر بہت اثر تھا۔ اسی لئے انھوں نے طے کیا کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز کی مقدس سرزمین میں اقامت اختیار کریں۔ چلتے وقت منشی نول کشور نے ایک معقول رقم بطور شکرانہ پیش کی، مولانا پر منشی نول کشور کی قدردانی اور حسن سلوک کا خاص اثر تھا۔ حجاز سے انھوں نے منشی صاحب کے نام جو خطوط لکھے ان سے ان کا اظہار ہوتا ہے

مولانا نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کی مگر آب و ہوا راس نہ آئی، بیمار پڑ گئے بڑے صاجزادے بیمار ہو کر وہیں انتقال کر گئے۔ مجبوراً مولانا ہندوستان واپس آ گئے اور پھر مطبع نول کشور میں کام کرنے لگے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ اور ندوۃ العلماء کی صدر مدرسی

۱۹۱۵ء میں مولانا مشہور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہو گئے، تقریباً پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، تھوڑے دنوں کام کیا تھا کہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا حکیم عبدالحی صاحب (صاحب گل رعنا) نے آپ سے استدعا کی کہ ندوۃ العلماء کی صدر مدرسی پر تشریف لائیے اور درس حدیث دیجیے۔ آپ نے یہ درخواست منظور کر لی، لوگوں نے مخالفت

بھی کی کہ اتنی بڑی تنخواہ کی ملازمت چھوڑ کر کم تنخواہ پر جانا کہاں تک درست ہے مگر آپ نے درس حدیث کے لئے دولت کی پرواہ نہ کی اور ندوۃ العلماء چلے آئے جہاں تنخواہ سو اور ڈیڑھ سو کے درمیان تھی، مولانا نے ندوہ میں درس دینا شروع کیا۔ اور آپ کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے علماء و فضلاء روزگار پیدا ہوئے۔ آخر عمر تک یہ اس عہدہ پر فائز رہے۔

انتقال ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۶ء میں مولانا امیر علیؒ کا صرف ۵۲ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس قلیل عمر میں انھوں نے اسلامی علوم کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مولانا کو اسلامی علوم کے علاوہ تاریخ جغرافیہ، ریاضی وغیرہ میں زبردست مہارت حاصل تھی۔

تصانیف اور تراجم (۱) مولانا امیر علی صاحبؒ کا شاہکار اُن کی تفسیر "مواہب الرحمٰن" ہے جو تیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اُردو زبان میں تو اتنی بڑی کوئی تفسیر نہیں لیکن دوسری زبانوں میں بھی اس پایہ کی چند ہی تفسیریں نکلیں گی۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ عربی اور فارسی کی تمام بڑی بڑی مستند تفاسیر کے اقتباسات بھی شامل ہیں اور مولانا نے فقہی مسائل کی تشریحات بھی کی ہیں۔ تصوف کے رموز و نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

(۲) "ترجمہ و شرح اُردو بخاری شریف"۔ یہ بھی مولانا کا ایک شاہکار ہے۔ حدیث کی مشہور کتاب بخاری کا اُردو ترجمہ اور شرح تیس جلدوں میں نہایت محنت و جانفشانی سے کی۔ افسوس یہ کتاب طبع نہ ہو سکی۔ اس کا مسودہ مطبع منشی نولکشور میں محفوظ ہے۔

(۳) "عین الہدایہ - اُردو ترجمہ و شرح ہدایہ" جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے، مولانا کی

شرح چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد بڑے سائز کے ہزار ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴) ترجمہ اُردو فتاویٰ عالمگیری" فقہ کی یہ عظیم الشان عربی کتاب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے علماء کے ایک بورڈ کے ذریعہ مرتب کرائی تھی، عربی زبان میں چار ضخیم جلدوں میں مولوی امیر علیؒ صاحب کی صحت کے ساتھ مطبع نول کشور سے شائع ہوئی، پھر مولوی صاحبؒ نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا جو بہت بڑے سائز کی پانچ جلدوں میں شائع ہوا، دوبارہ اس کو دس جلدوں میں شائع کیا گیا۔

فتاویٰ کے شروع میں مولاناؒ نے تقریباً تین سو صفحات کا ایک مقدمہ لکھا، جو بیحد مفید ہے۔ صرف فتاویٰ کا اُردو ترجمہ ہی مولانا کا زبردست کارنامہ ہے۔ یہ ایسا کام تھا جس کے لئے ایک دارالترجمہ ہوتا تب بھی شاید اتنی جلدی مکمل نہ ہوتا جتنی جلدی تنہا مولانا نے کر دیا۔

(۵) "فیضی کی مشہور تفسیر سواطع الالہام" عربی زبان میں قرآن کی بے نقط تفسیر ہے۔ مولانا نے اس کے شروع میں بے نقط الفاظ میں مقدمہ لکھا اور اشاعت سے قبل تفسیر کی صحت کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان میں ان کو کس قدر مہارت حاصل تھی۔

چھوٹی کتابیں اور ترجمے تو بہت ہیں لیکن کچھ اور بھی اہم کام ترجمے سے متعلق مولانا نے انجام دیئے ہیں جن کو تفصیل کے ساتھ آئندہ کسی مضمون میں پیش کیا جائے گا۔

امام غزالیؒ کے تعلیمی و اصلاحی کارنامے

مفکرین اسلام میں جتنی شہرت اور مقبولیت حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ کو حاصل ہوئی وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ علماء اسلام کا ایک طبقہ ان کو اپنے عہد کا مجدد تسلیم کرتا ہے۔ ایک بلند پایہ عالم، حق آگاہ فلسفی، عظیم المرتبت صوفی اور زبردست مجتہد کی حیثیت سے ساری دنیائے اسلام ان کی عظمت کی معترف ہے

امام صاحبؒ کے افکار و نظریات نے جمہور اسلام کے دلوں پر ایسے نقوش ثبت کئے جن کے اثرات صدیوں سے قائم ہیں، وہ ایک جامع شخصیت کے حامل تھے، ایک طرف علوم اسلامی پر ان کا تبحر اور وسعت نظر مسلم تھی تو دوسری طرف فلسفہ میں انکی موشگافیوں نے ایک انقلاب پیدا کر دیا، اسی کے ساتھ ساتھ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے ہر دور کے ماہرین تعلیم سے خراج تحسین حاصل کیا، ان کے تعلیمی اصول و نظریات کو عہد حاضر کے ترقی یافتہ اور ممتاز علماء و فضلاء نے اپنایا۔

امام غزالیؒ نے مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی پر غور و فکر کی نظر ڈالی، سیاست حکمت کی صحیح راہ دکھائی، علم اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کی مفید عقلی و نقلی تشریحات

پیش کیں جن کو عوام و خواص سب ہی نے بتدریج قبول کیا۔ جدید علم کلام کی بنیاد بھی انہی کی رکھی ہوئی ہے، انھوں نے فلسفہ کی اصلاح کی۔ ابتدا میں یونانی فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا، لیکن غور و فکر کے بعد ان نظریات کا قوی دلائل سے ابطال کیا جو اسلامی تعلیمات و عقائد کے برعکس تھے۔ اسی لئے فلاسفہ کا ایک بڑا گروہ ان کا مخالف ہو گیا، امام صاحب نے بڑی ہمت و جرأت سے کام لیا اور ان مروجہ عقائد و خیالات اور غلط نظریات پر بے لاگ تنقید کی جو تعلیمات اسلام کے خلاف تھے اور جن کا شکار خود بڑے بڑے علماء اُمت بھی ہو چکے تھے۔ بے عمل علماء اور گمراہ صوفیاء کے لئے ان کی تحریریں تازیانۂ عبرت تھیں، اسی لئے ان پر کفر کے فتوے بھی لگائے گئے، ان کی تصانیف جلائی گئیں اور ہر طرف ان کی مخالفت کے طوفان اُٹھانے کی کوششیں کی گئیں، لیکن مخالفین کی یہ سرگرمیاں بے سود رہیں اور غلط فہمیوں کے بادل چھٹتے دیر نہیں لگی۔ ایک تھوڑے عرصہ میں امام صاحبؒ ساری دنیائے اسلام کے محبوب ترین رہنما سمجھے جانے لگے، اسلامی دنیا عام طور پر ان کے خیالات سے متاثر ہوئی اور مسلمانوں کے عقائد پر رنگ غالب آیا۔

امام غزالیؒ قریۂ غزالہ ضلع طوس (ایران) میں ۴۵۰ھ (۱۰۵۹ء) کو پیدا ہوئے۔ علامہ شبلیؒ نے ابن خلکان کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام صاحب ضلع طوس کے مقام طاہران میں پیدا ہوئے تھے اور غزالہ نام کا کوئی گاؤں طوس میں نہیں ہے۔ چونکہ امام صاحب کے والد رشتہ فروش تھے اور عربی میں غزل کے معنی کاتنے کے ہیں اسی لئے عربی نسبت کے قاعدہ کے مطابق ان کو غزالی کہا جاتا ہے۔

امام صاحب کا نام محمدؒ، کنیت ابو حامد، لقب حجۃ الاسلام اور عرفیت غزالی ہے۔

ان کے والد ماجد غریب آدمی تھے اور سوت کات کر گزر بسر کرتے تھے، خود ان پڑھ تھے لیکن علماء اور صوفیاء کی صحبت میں بیٹھنے کا شوق تھا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ان کی کوئی اولاد نرینہ ہو جو علم و فضل کے گہوارہ میں تربیت پائے اور اس کے لئے وہ کبر سنی کے باوجود بارگاہ ایزدی میں دست بہ دعا رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سن لی اور امام صاحب پیدا ہوئے، اور آپ کے بعد آپ کے دوسرے بھائی احمد غزالی پیدا ہوئے جو بلند پایہ عالم اور خوش بیان واعظ گزرے ہیں۔

امام صاحب نے ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی، باپ کے سایۂ عاطفت سے جلد محروم ہو گئے مگر باپ کی وصیت کے بموجب ان کے ایک دوست نے امام صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی کی تعلیم و تربیت اپنی سرپرستی میں کی۔ بنیادی تعلیم کی تکمیل کے بعد نیشاپور کا رخ کیا جو اس عہد میں دنیائے اسلام کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا۔ وہاں کے عظیم الشان مدرسہ نظامیہ میں امام الحرمین ابو المعالی جوینی صدر مدرس تھے امام غزالی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت کے باعث امام الحرمین کی نظر میں ممتاز بن گئے۔ یہاں فقہ، حدیث، علم کلام اور مقدمات فلسفہ کی تعلیم حاصل کی، اٹھائیس سال کی عمر میں علوم متداولہ میں کمال حاصل کر کے اپنا حلقۂ درس قائم کر چکے تھے اور ان کی علمی قابلیت اور غیر معمولی ذہانت کی اچھی خاصی شہرت اسلامی دنیا میں پھیل چکی تھی۔

۴۷۸ھ (۱۰۸۵ء) میں امام الحرمین کا انتقال ہو گیا۔ امام صاحب مشفق استاد کے انتقال کے بعد معسکر چلے گئے، جہاں نظام الملک کا قیام تھا جو سلجوقی بادشاہ ملک شاہ کا وزیر اعظم تھا، جو اپنی معارف پروری و علم دوستی کے باعث ساری اسلامی

دنیا میں معزز سمجھا جاتا تھا، اس نے امام صاحب کی بہت قدر و منزلت کی، اپنے دربار میں متعدد بار علمی مباحثے کرائے جن میں امام صاحب کے مقابلے میں اس عہد کے بڑے بڑے علماء و فلاسفہ آئے مگر ان کے سامنے کسی کی علمیت کا چراغ نہ جل سکا نظام الملک کو اندازہ ہو گیا کہ دنیائے اسلام میں اس پایہ کا کوئی دوسرا عالم مشکل ہی سے ملے گا۔ اس نے مدرسہ نظامیہ بغداد کی صدارت آپ کو تفویض کی، یہ مدرسہ اس عہد میں دنیا کی سب سے بڑی درسگاہ تھی، جہاں تمام مروجہ علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا انتظام تھا۔ ۴۸۴ھ ہجری مطابق ۱۰۹۱ء کو امام صاحبؒ نظامیہ کی مسند صدارت پر متمکن ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے فضل و کمال کے باعث ارکین سلطنت سے زیادہ با اثر بن گئے۔

امام صاحبؒ کے حلقۂ درس میں سو طلباء کی جماعت ہوتی تھی اور بڑے بڑے علماء و فضلاء بھی درس میں شریک ہوتے تھے، چار سال تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا لیکن تلاش حق کی خلش رہ رہ کر بےچین کرتی تھی، پہروں غور و فکر میں رہتے تھے۔ یہ خلش اتنی بڑھی کہ دنیاوی عظمت، اور جاہ و جلال کو ٹھکرا دیا اور اپنے معزز عہدے سے استعفیٰ دے کر بے سر و سامانی کے ساتھ ۴۸۸ھ ہجری میں بغداد سے چل کھڑے ہوئے اور ۴۹۸ھ ہجری تک پورے دس سال ادھر اُدھر پھرتے رہے، بغداد سے دمشق گئے، وہاں سے شام کا رُخ کیا۔ دو سال گزار کر بیت المقدس کی راہ لی، پھر حج کے لئے مکہ معظمہ پہنچے، وہاں سے اہل و عیال کی یاد وطن لے گئی، اور وطن پہنچ کر عزلت گزینی اختیار کرلی، اپنی سب سے بڑی اور بلند پایہ تصنیف احیاء العلوم اسی دس سالہ سیاحت میں مکمل کی۔

امام صاحبؒ کے دل میں تلاش حق کی ایسی خلش پیدا ہوئی کہ وہ رات دن غور و فکر میں ہمہ تن مشغول رہتے تھے، انھوں نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری "المنقذ من الضلال" میں لکھا ہے کہ نظامیہ بغداد کی صدارت کے آخری چھ ماہ بڑی بے چینی سے گزرے۔ ایک طرف دنیاوی جاہ و جلال کی کشش تھی، دوسری طرف حق کی جستجو کی لگن۔ نظامیہ کی صدر مدرسی اس دور میں سب سے بڑا اور معزز عہدہ تھا مگر امام صاحب نے اسے اچانک چھوڑ دیا اور فقر و اخلاص کی زندگی اختیار کی، اسی زمانے سے ان کی زندگی کا عہد زریں شروع ہوا جس میں انھوں نے ایک مجدد کی حیثیت اختیار کی اور اپنی تحریروں اور تقریروں سے اسلام کی صحیح تعلیمات کو منظر عام پر لانے کی مسلسل جد وجہد کی، احیاء العلوم، کیمیائے سعادت اور دوسری بلند پایہ تصانیف پیش کیں، جن کی مقبولیت ان کی زندگی ہی میں حاصل ہو چکی تھی "المنقذ من الضلال" میں امام صاحبؒ نے لکھا ہے کہ بیس سے پچاس سال کی عمر تک ظاہری، باطنی، فلسفی، متکلم، لامذہب ہر ایک سے ملا، ان کے عقائد کا سراغ لگایا، تحقیق کے شوق میں مختلف فرقوں کی کتابیں پڑھیں اور تلاش حق کا سلسلہ جاری رکھا، تصوف کی طرف ابتدا ہی سے رجحان تھا۔ جب طبیعت اس طرف زیادہ مائل ہوئی تو شیخ بوعلی فارمدی جیسے جلیل القدر صوفی کے ہاتھ پر بیعت کی لیکن سلوک کی منزلیں نظامیہ بغداد کی ملازمت ترک کرنے کے بعد طے کیں۔

امام صاحبؒ نے جو انقلابی اصلاحات پیش کیں ان کی مخالفت بھی بڑے زور شور سے ہوئی، علماء و صوفیاء نے بھی مخالفت کی اور فلاسفہ و متکلمین نے بھی اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ شدت مخالفت میں ان کی تصنیفات جلائی گئیں لیکن انکی

اصلاحات کی بنیاد حق پر تھی اس لئے دنیائے اسلام عام طور سے ان کے خیالات افکار سے متاثر ہوئی اور مسلمانوں کے عقائد پر امام صاحب کا رنگ غالب آیا۔

۴۹۸ھ کے آخر میں گمراہانہ عقائد و خیالات کا بہت زور ہو گیا تھا، علماء کے باہمی اختلافات، فلاسفہ و متکلمین کی نوک جھونک کے اثرات عام مسلمانوں پر بھی پڑ رہے تھے، ان حالات نے امام صاحبؒ کو بے چین کر دیا، اتفاق سے نظام الملک کا بیٹا فخر الملک وزارت عظمیٰ پر فائز تھا اور دل میں دینی تڑپ رکھتا تھا، اس نے امام صاحب کو دعوت دی کہ دوبارہ نظامیہ بغداد کی مسند صدارت پر رونق افروز ہوں، امام صاحب نے بغداد کے بجائے نظامیہ نیشاپور کو پسند کیا اور ایک سال تک درس و تدریس، وعظ و تبلیغ میں مصروف رہے لیکن بدقسمتی سے ۵۰۰ھ میں فخر الملک ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہو گیا تو کچھ دنوں بعد امام صاحب نے بھی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بدستور اپنے وطن میں سکونت اختیار کر لی مگر شمع علم کے پروانوں کا ہجوم بھلا کیسے کم ہوتا، مجبوراً حلقۂ درس بھی جاری رہا اور تزکیۂ نفس اور سلوک کے مراحل بھی طے ہوتے رہے اور یہ سلسلہ آخری وقت تک قائم رہا۔ یہاں تک کہ دنیائے اسلام کا یہ آفتاب علم غروب ہو گیا۔ انتقال کے واقعہ کو آپ کے بھائی امام احمد غزالی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ انتقال کے دن بعد نماز فجر آپ نے جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے اپنا کفن منگوایا اور اس کو آنکھوں سے لگایا، چوما اور رکھ دیا، پھر بلند آواز سے کہا "آقا کا حکم سر آنکھوں پر" اور لیٹ گئے دیکھا گیا تو روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ یہ واقعہ دوشنبہ کے دن ۱۴ جمادی الآخر ۵۰۵ھ مطابق ۱۱۱۱ء کو پیش آیا تھا۔

امام صاحب کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، ان کی ایک لڑکی تھی ست المنیٰ جن کی

اولاد کا پتہ آٹھویں صدی ہجری تک چلتا ہے۔ امام صاحبؒ کے انتقال سے علمی دنیا میں بڑا تہلکہ مچ گیا، ساری اسلامی دنیا میں ان کا سوگ منایا گیا، شعراء نے رنج و غم کے جذبات کو نظم کیا۔ سلاطین نے ایک زبردست ماہر تعلیم و اسلامیات کی بُری طرح کمی محسوس کی، امام صاحب کی عمر کوئی زیادہ نہ تھی۔ صرف پچپن برس دنیا میں گزار سکے، مشیت ایزدی پوری ہو چکی تھی ورنہ امام صاحبؒ کے ہاتھوں نہ معلوم دین کی کتنی خدمات انجام پاتیں۔ امام صاحبؒ کے چھوٹے بھائی امام احمد غزالیؒ بھی بڑے جید عالم تھے اور واعظ کی حیثیت سے ان کو اپنے زمانہ میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

امام صاحب علمی و درسی مشاغل کے علاوہ مجاہدات نفس میں بھی کسی بڑے سے بڑے صوفی سے پیچھے نہ تھے، ان کے اوقات ریاضت و عبادات میں بہت صرف ہوتے تھے خصوصاً زندگی کے آخری پانچ چھ سال انھوں نے زیادہ سے زیادہ عبادت میں گزارے۔ اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک عبادات کے لئے، دوسرا طلباء کی تدریس کے لئے، اور تیسرا اہل دل کی اصلاح و تربیت کے لئے۔

پچاس سے زیادہ صوفی اور طلباء ان کے زیر تربیت رہتے تھے، جن کے لئے انکی خانقاہ میں ہر قسم کے انتظامات تھے۔

اخلاقی و تعلیمی اصلاحات

امام غزالیؒ دنیائے اسلام کے پہلے ماہر تعلیم ہیں جنھوں نے تعلیم کے اہم مسائل پر گہری نظر ڈالی اور دور رس نتائج اخذ کئے، انھوں نے اسلام کے تعلیمی نصب العین کو سامنے رکھ کر اساتذہ اور طلباء کے لئے لائحہ عمل بنایا، نصاب تعلیم کی اصلاح کی، مفید

غیر مفید علوم کی نشاندہی بھی کی، دینی و دنیاوی علوم کا تعین کیا، غرض تعلیم کے ہر ہر پہلو کو معرض بحث میں لائے، اپنے عملی تجربہ کے بعد ایسے اصول وضوابط متعین کئے، جن کی افادیت اس ترقی یافتہ دَور میں بھی مسلّم ہے۔

احیاء العلوم میں امام غزالیؒ نے کتاب العلم کے نام سے ایک پورا باب قائم کیا ہے جس میں پہلے علم کی فضیلت اور اہمیت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ اس کے بعد عقلی و نقلی دلائل سے اس کے فوائد سے بحث کی ہے۔ ہر ایک فصل میں طلباء کے لئے دس اصول متعین کئے جن کی روشنی میں ان کو اپنی طالب علمی کا زمانہ گزارنا چاہئے حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب کے پیش کردہ اصول اس دَور میں بھی طلباء کے لئے اتنے مفید ہیں کہ اگر ابتداء سے ان کے پیش نظر تربیت کی جائے تو وہ تمام انتشار اور ذہنی آوارگی خود بخود ختم ہو جائے جس کے باعث طلباء کا معاملہ حکومتوں کے لئے دردسری کا باعث ہے۔ امام صاحبؒ کے پیش کردہ دس اصولوں کا اجمالی خاکہ ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) رذائل اخلاق اور صفات قبیحہ سے دور رہنا اور دل کو پاک و صاف رکھنا۔

(۲) دنیاوی علائق کو کم کرنا، اہل وعیال اور وطن سے دور رہنا تاکہ یکسوئی سے طلب علم جاری رہے۔

(۳) اپنے علم پر مغرور نہ ہو، نہ اپنے اُستاد سے تحکمانہ پیش آئے بلکہ اپنے کو اُستاد کی مرضی پر چھوڑ دے اور انکی ہر بات اس طرح مانے جس طرح کوئی جاہل بیمار مشفق طبیب کی بات مانتا ہے اور انکی خدمت کو ذریعہ شرف سمجھے۔

(۴) اپنی تعلیم کے دَوران میں مختلف مسائل اور معاملات پر لوگوں کے اختلافات کو سُننے سے پرہیز کرنا، اس لئے کہ اختلافات کی باتیں سُننے سے عقل حیران اور

ذہن پریشان اور رائے شکست ہو جاتی ہے۔

(۵) سب مفید اور اچھے علوم سے واقفیت حاصل کرنا اور ان کے مقاصد علت غائی کو سمجھنا اور بشرط فرصت کسی ایک میں کمال حاصل کرنا۔

(۶) جو علوم حاصل کرنا ہوں ان میں ترتیب کا لحاظ رکھنا۔ جو زیادہ اہم ہو اس سے ابتداء کرے اور جو زیادہ مفید ہو اور جس کے ذریعہ سے معرفت الٰہی کے حصول کا بھی امکان ہو جو انسان کے لئے بہر حال سر مقاصد ہے۔

(۷) ایک فن کو اچھی طرح حاصل کئے اور سمجھے بغیر دوسرے کو شروع نہ کرے۔

(۸) اس ذریعہ کا معلوم کرنا جس سے یہ علم کا شرف حاصل ہوتا ہو اور یہ دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے اول نتیجہ کے اعتبار سے، دوم دلائل کی پختگی کے لحاظ سے۔

(۹) طالب علم کا مقصد تحصیل علم سے اپنے باطن کو آراستہ کرنا، فضائل اخلاق سے مزین ہونا اور اللہ تعالیٰ کی رضا و قرب کا حصول ہو۔

(۱۰) اپنے اصل مقصد سے علوم کا تعلق معلوم کرنا تاکہ جو علم مقصد سے قریب ہو اسکو ترجیح دے سکے۔

مذکورہ اصولوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے بڑے ماہرین تعلیم اور علماء نے ہر دور میں مختلف عنوانات سے انھیں اصولوں کو طلباء کے لئے مفید قرار دیا ہے اور آج بھی طلباء کی ساری بیماریوں کا علاج انہی اصولوں میں مضمر ہے۔ امام غزالی نے اساتذہ کے لئے بھی آٹھ اصول متعین کئے ہیں اور وہ ایسے مؤثر اصول ہیں کہ اگر اساتذہ کی تربیت ان کے مطابق ہو تو تعلیم کے بہت سے اُلجھے ہوئے اور اخلاقی معاملات خود بخود حل ہو سکتے ہیں، اساتذہ کے تربیتی اصولوں پر بھی ایک نظر ڈالئے۔

(۱) اُستاد کو چاہیئے کہ اپنے شاگردوں پر شفقت کرے اور ان کو اپنے بیٹوں کی طرح سمجھے۔

(۲) علم سکھانے کی کوئی اُجرت نہ لے نہ کسی قسم کے بدلے اور شکریہ کا خواہشمند ہو بلکہ مقصد صرف رضائے الٰہی ہو۔

(۳) شاگرد کو نیک نصیحت کرنے میں کوئی کمی وکوتاہی نہ کرے۔

(۴) شاگرد کو بُری عادتوں سے بذریعہ اشارہ وکنایہ روکے اور پیار ونرمی سے منع کرلے۔ غصہ گرمی اور ڈانٹنے جھڑکنے سے پرہیز کرے کیونکہ ان سے ان کا رعب جاتا رہتا ہے۔

(۵) جس فن کا اُستاد ہو اس کے علاوہ دوسرے فنون کی بُرائی نہ کرے۔ یہ طالب علم کے لئے مُضر ہے۔

(۶) سمجھانے اور پڑھانے میں طالب علم کی سمجھ اور ذہن کو پیش نظر رکھے جو باتیں اسکی سمجھ سے باہر ہوں وہ نہ بتائے نہ ایسا اسلوب بیان اختیار کرے جو انکی عقلوں میں نہ آسکے ورنہ وہ اس علم سے نفرت کرنے لگیں گے۔

(۷) اگر کوئی شاگرد کم عقل ہے تو اس کو موٹی موٹی باتیں بتائی جائیں مگر یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ اس کو باریک باتیں قصداً نہیں بتائی جارہی ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے طالب علم ان موٹی باتوں کی طرف کبھی رغبت نہ کرے گا اور اُستاد کی طرف سے اس کے دل میں بدگمانی پیدا ہوگی۔

(۸) اُستاد اپنے علم کے مطابق عمل کرے اور اس کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو۔

امام صاحبؒ کے ان اصولوں کی افادیت میں کون شبہ کرسکتا ہے۔ یورپ کے

بڑے بڑے ماہرین نے بھی امام صاحب کے ان اصولوں کو اپنایا اور بعض نے تو ایمانداری سے اسکی صراحت کردی کہ ان اصولوں کی طرف رہنمائی سب سے پہلے امام غزالی ہی نے کی تھی۔

امام صاحب نے اصلاح تعلیم کے سلسلہ میں طرز تعلیم، نصاب تعلیم کی اصلاح پر خاص توجہ کی اور اس دور کی مروجہ تعلیم کی خامیوں کو اچھی طرح دیکھ بھال کر اپنی مفید اصلاحات پیش کیں۔ ان خامیوں کو اجمالی طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے جو اس عہد میں پیدا ہو گئی تھیں۔

(۱) مذہبی اور غیر مذہبی علوم میں خلط مبحث ہو گیا تھا بعض غیر مذہبی علوم مذہبی علوم میں شامل ہو گئے تھے اور ان کی تعلیم پر پوری توجہ دی جاتی تھی جس کے سبب سے حقیقی مذہبی اور اخلاقی تعلیم پر کم توجہ کی جاتی تھی۔

(۲) بعض غیر مذہبی علوم کو مذہبی علوم سمجھا جاتا تھا اور ان مسائل میں اختلافات پیدا ہوتے تھے تو ان کو مذہبی اختلافات کا رنگ دیا جاتا تھا، جس کے باعث علماء بیکار بحث و مباحثہ میں نہ صرف اپنا وقت ضائع کرتے تھے بلکہ عام مسلمانوں پر اس کا برا اثر پڑتا تھا اور طرح طرح کے جھگڑے اور مجادلے برپا ہو جاتے تھے۔

(۳) صنعتی علوم و فنون نصاب تعلیم میں شامل نہ تھے، حالانکہ ان کی ضرورت اور افادیت مسلم تھی۔

(۴) فلسفہ و منطق جو عقلی علوم ہیں داخل نصاب نہ تھے۔

(۵) اخلاقی تعلیم کا کوئی نصاب نہ تھا۔

امام غزالی نے ان تمام خامیوں کو اچھی طرح محسوس کیا۔ مدرسہ نظامیہ بغداد میں چار سال درس دینے کے باعث اس دور کی تعلیمی حالت کا آپ کو پورا اندازہ

ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ نے احیاء العلوم میں جو ترک نظامیہ کے بعد لکھی تھی، ان تمام خامیوں پر شرح و بسط سے روشنی ڈالی اور ان کی اصلاح کی تجاویز پیش کیں، امام صاحب کی تعلیمی اصلاحات کا اجمالی خاکہ حسب ذیل ہے :-

(۱) مذہبی اور غیر مذہبی علوم کا تعین کیا اور علوم کو دو قسموں پر منقسم کیا۔ ایک فرض عین، جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ جیسے عبادات و عقائد وغیرہ۔ دوسرے فرض کفایہ جس کا سیکھنا ہر ایک کے لئے ضروری نہیں بلکہ قوم کے کچھ افراد کا سیکھ لینا کافی ہے۔ جیسے علم طب و حساب۔

اس دور کے علماء کا اس مسئلہ پر اختلاف تھا، فقہاء فقہ کو، مفسرین تفسیر کو، محدث حدیث کو اور متکلم علم کلام کو فرض عین قرار دیتے تھے، مگر امام صاحب کی رائے سب سے جدا تھی انھوں نے تمام مروجہ علوم کو فرض کفایہ قرار دیا اور انھوں نے فرض کفایہ کو دو قسموں پر تقسیم کر دیا۔ علوم شرعیہ اور علوم دنیوی۔ علوم شرعیہ میں تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام کو فرض کفایہ قرار دیا اور غیر شرعیہ میں طب و حساب وغیرہ کو صنعتی علوم و فنون کی تحصیل پر امام صاحب ہی نے سب سے پہلے زور دیا۔ اور احیاء العلوم میں طب، حساب۔ سیاسیات زراعت، خیاطی، پارچہ بافی وغیرہ کی طرف توجہ دلائی۔

امام غزالی نے جس عہد میں تحصیل علم شروع کی تھی، اس وقت یونانی فلسفہ و منطق کا ساری دنیائے اسلام میں چرچا تھا۔ یونانی فلسفہ کی کتابوں کے عربی میں ترجمے ہو چکے تھے اور بڑے بڑے علماء اسلام فلسفیانہ بحثوں میں اپنے اوقات صرف کرتے تھے، امام صاحب نے بھی بہت غور و فکر سے منطق و فلسفہ کا مطالعہ کیا اور ان خرابیوں پر ان کی نظر پہنچ گئی جو فلسفہ کی ترویج سے پیدا ہو گئی تھیں۔ یونانی فلسفہ کے بعض مسائل عقائدِ

اسلام کے خلاف تھے اور علماء و فلاسفہ کی بحثوں کے سبب سے عوام کے عقائد پر بھی بُرے اثرات پڑتے تھے۔ بڑے بڑے مسلمان فلسفی بھی غزالیؒ سے پہلے گزر چکے تھے، جنھوں نے فلسفۂ یونان کی آڑ لے کر عقائدِ اسلام پر اعتراضات کی بوچھار کی تھی، جن میں حکیم بوعلی سینا اور فارابی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ امام صاحبؒ نے ان تمام نظریات فلسفہ کا ابطال کیا جو عقائدِ اسلام پر نظرانداز ہوتے تھے اور بڑے وزنی اور پُرزور دلائل سے اسلامی عقائد کی حقانیت کا اثبات پیش کیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے فلسفہ و منطق کو داخلِ نصاب کیا۔ تہافۃ الفلاسفہ نامی کتاب اسی غرض سے تصنیف کی۔ اس دور کے علماء فلسفہ کو نصابِ تعلیم میں داخل کرنے کے خلاف تھے۔ امام صاحبؒ کی اس جرات پر سب نے پُرزور مخالفت کی، لیکن آپ نے "المنقذ من الضلال" میں لکھا کہ فلسفہ کے تمام اجزاء یعنی طبعیات، ریاضیات، اخلاق اور الہیات میں سوا الہیات کے اور کوئی چیز اسلام کے عقائد کے خلاف نہیں۔

امام صاحبؒ نے عقائدِ اسلامی کو سب سے پہلے دلائلِ عقلیہ سے ثابت کیا۔ انھوں نے پہلی بار معقول و منقول کے درمیان تطبیق پیدا کی، علماء کی وقتی مخالفت بے اثر رہی اور تھوڑے ہی عرصہ میں تمام اسلامی ممالک میں فلسفہ اور منطق داخلِ نصاب ہو گیا۔

امام غزالیؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علمِ کلام کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے مرتب کیا۔ استدلال کے نئے طرز و طریقے نکالے اور بہت سے محکم اصول مرتب کیے اور علمِ کلام کی مدد سے فلسفۂ یونانی کے ان اعتراضات کو رد کیا جو اسلامی عقائد پر کیے جاتے تھے۔ امام صاحبؒ سے پہلے علمِ کلام کی بنیاد پڑ چکی تھی مگر اس کو باقاعدہ فن کی صورت امام صاحبؒ نے دی اور نصابِ تعلیم میں بھی اس کو داخل کیا، علماء نے اسکی

بھی مخالفت کی مگر مخالفت کا اثر عارضی ثابت ہوا، اور علم کلام کی تعلیم ہر جگہ رائج ہوگئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے فائدہ بھی پہنچا۔ امام صاحبؒ نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ علم اخلاق کی تعلیم و ترویج پر بہت زور دیا اور اس کو ایک فن کی صورت پر مرتب کیا۔ انھوں نے اخلاقی اصولوں کو فلسفہ سے اخذ کیا لیکن ان میں ایسی مصلحانہ جذّتیں کیں کہ اس میں کشش پیدا ہوگئی، انھوں نے علم اخلاق کو فلسفہ کی آمیزش سے اتنا وسیع بنا دیا کہ یونانیوں کا علم اخلاق ماند پڑ گیا۔ امام صاحبؒ نے محاسن و رذائل کی تشریحات اسلامی بنیاد کی تعلیمات پر کی ہیں۔ احیاء العلوم کا ایک بڑا حصہ علم اخلاق سے متعلق ہے۔ اخلاقی تعلیم کی جد و جہد میں امام غزالیؒ کے کارناموں پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ زمانۂ حال کے مصری فاضل ڈاکٹر زکی مبارک نے الاخلاق عند الغزالی کے نام سے ایک بہترین تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے امام صاحبؒ پر اکثر مقامات پر سخت تنقید کی ہے۔ بعض موقعوں پر تنقید پر تنقیص کا پہلو بھی آجاتا ہے۔ تاہم ان کے ذاتی خیالات سے قطع نظر امام صاحبؒ کی اخلاقی تعلیم کو سمجھنے کے لئے انکی افادیت مسلّم ہے۔

امام صاحبؒ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ خواہ اخلاقی مسائل ہوں خواہ تعلیمی، فلسفیانہ بحث ہو یا علم کلام کی باریکیاں سب کو سمجھانے اور دل نشین کرنے کا بہت مؤثر طریقہ اختیار کیا ہے۔ بہت سادہ اور آسان طرز میں قصّوں اور چٹکلوں کے پیرایہ میں بڑی اہم باتوں کو دل و دماغ کی گہرائیوں میں اُتار دیتے ہیں۔ علم کے ساتھ ساتھ عمل کی ترغیب دیتے ہوئے اپنے فارسی رسالہ خلاصۃ التصانیف میں ایک شاگرد کو سطرح سمجھا رہے ہیں :-

"اے فرزند از اعمال نفس واز افعال تہی واز معانی خالی مباش ویقین می داں کہ علم مجرد دستگیری نہ کند و ترا ازیں مثالے معلوم گردد کہ اگر کسے در بیاباں می رود و دہ شمشیر ہندی در نیام دارد و ہمچنیں دیگر سلاحہا نیکو، مع ہذا اہل سلاح و اہل جنگ و محاربت باشد و ناگاہ شیرے بادی درآید۔ چہ گوئی آں ہمہ سلاحہائے وے بے آنکہ کار فرماید آں شیر از وے دفع کند یانہ و تو نیک دانی کہ نہ کند، ہمچنیں بعینہ می داں کہ اگر کسے صد ہزار مسئلہ علمی بخواند و بداند و بہ عمل نیارد از اں دانش او افادہ نخواہد بود"۔

(خلاصۃ التصانیف مطبوعہ ابودیال پریس پونا ص ۳۲ و ص ۳۳)

اس طرح کی ہزار دں مثالیں امام صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں دی ہیں اور بڑے اہم مسائل کو ذہن نشین کرایا ہے۔

امام غزالیؒ نے عام طور پر پھیلے ہوئے اس خیال کی دلائل و براہین سے تردید کی ہے کہ علوم عقلیہ اور نقلیہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور یہ کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں ہو۔ آپ نے بتایا کہ یہ خیال کوتاہ نظری پر مبنی ہے۔ بظاہر تو علوم شرعیہ میں بعض ایک دوسرے کے مخالف و منافی ہیں اور عوام الناس ان کے درمیان تطابق نہیں کر پاتے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

امام غزالی اس دنیا میں صرف پچپن ۵۵ سال زندہ رہے، سن شعور تک پہنچنے اور تحصیل علم میں بیس سال گزارے، پھر مسند درس و تدریس پر بیٹھے اور ساتھ ہی ساتھ علوم و فنون کا مطالعہ شروع کیا۔ چونتیس ۳۴ سال کی عمر میں نظامیہ بغداد کے صدر مدرس ہوئے،

اور چار سال اس بلند پایہ عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں ۔ اس طرح مشکل سے پندرہ سال ایسے ملے جن میں انھوں نے اپنی مصلحانہ جدوجہد کی اور مجددانہ کارناموں کو پیش کیا اور درس و تدریس، عبادات و اشغال، تقاریر و مواعظ کے ساتھ ساتھ تقریباً بہتر کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں احیاء العلوم جیسی بڑی کتابیں بھی شامل ہیں ۔ ان کی ساری عمر پر ان کے لکھے ہوئے اوراق کو تقسیم کیا گیا تو سولہ صفحات یومیہ کا اوسط پڑتا ہے جو نہ صرف حیرت انگیز ہے بلکہ ان کے مجدد ہونے کی بین دلیل ہے ۔ خدا نے ان کو ایک بڑے مقصد کے لئے پیدا کیا تھا، اسی لئے ان کے اوقات میں برکت بھی عطا فرمائی تھی ۔

امام صاحبؒ کی ان اصلاحات کی ان کے سامنے ہی علماء نے سخت مخالفت کی، انکی کتابیں جلائی گئیں مگر غلط فہمیوں کے یہ غبار بھی تھوڑے عرصہ میں چھٹ گئے بلکہ انکی زندگی ہی میں اسلامی ممالک میں ان کی شہرت پھیلی اور ان کی اصلاحات کو مقبولیت عام حاصل ہونے لگی تھی ۔

امام صاحبؒ نے ایسے دور میں آنکھیں کھولی تھیں جب اہل سنت میں دو فرقے پیدا ہو گئے تھے ۔ ایک معتزلہ، دوسرا اشعریہ ۔ اوّل الذکر کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا کی تمام باتیں مصلحت پر مبنی ہیں، ایک ذرہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہے ۔ خدا نے انسان کو اپنے افعال کا مختار اور ذمہ دار بنایا ہے اس فرقہ کا سرگروہ ابوالہذیل تھا، جس کو بانی علم کلام کہا جاتا ہے ۔ ثانی الذکر کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا کے احکامات مصلحت پر مبنی نہیں ہیں اور انسان کو اپنے افعال پر قدرت بھی نہیں حاصل ہے ۔ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے ۔ اس گروہ کا سردار امام ابوالحسن علی اشعری ہے ۔ دونوں فرقوں کے علماء میں سخت مباحثے ہوتے تھے اور عوام کے عقائد میں تزلزل پیدا ہوتا تھا ۔ امام صاحبؒ کی

جلد جلد سے یہ اختلافات کم ہو گئے اور جو کچھ باقی رہے ان کے اثرات پہلے جیسے خطرناک نہ رہے۔

امام صاحبؒ نے جس بات کو حق سمجھا اس کو بلا کسی خوف و ڈر کے ظاہر کیا، انھوں نے علماء اور امراء کی دل کھول کر مذمت کی، حالانکہ وہ دور علماء کے عروج و اقتدار کا تھا۔ دنیائے اسلام میں بڑے بڑے فاضل علماء اور صوفیاء کی کثرت تھی، علوم و فنون کا عام چرچا تھا، علماء میں ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا جو علانیہ کلمۃ الحق کہنے اور اشاعت دین میں مصروف تھا بعض کی جرات حق اور بے خوفی سے بڑے بڑے سلاطین لرزہ براندام رہتے تھے۔

صوفیاء میں ابوالحسن خرقانیؒ ابو علی فارمدیؒ جیسے خدا رسیدہ لوگ موجود تھے۔ ثانی الذکر کے ہاتھ پر امام صاحبؒ نے بیعت کی تھی۔ تاہم اس دور میں علمی اخلاقی اور دینی اصلاحات کی قیادت امام صاحبؒ کے ہاتھ رہی۔

اہل یورپ نے امام صاحبؒ کی تصانیف کی نہ صرف قدر کی بلکہ ان سے پورے طور پر فائدہ اُٹھایا۔ یورپین زبانوں میں احیاء العلوم اور بعض دوسری کتب کے ترجمے ہو چکے، امام صاحب کی صرف ایک کتاب احیاء العلوم ایسا شاہکار ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے اور یہ کتاب منتہی اور مبتدی دونوں کے لئے مفید ہے۔

امام صاحبؒ کے افکار و نظریات کی اشاعت و ترویج کی اس پُر آشوب دور میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ارباب علم و فضل کے ذمہ یہ ایک بڑا فرض ہے کہ وہ ان کے خیالات کو دنیا کے سامنے پیش کریں، خود اسلامی دنیا کے حالات اس امر کے متقضی ہیں کہ امام صاحبؒ کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنائیں جو سب کے سب قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب و مدون کئے گئے ہیں۔

کسی اجمالی مضمون میں امام غزالیؒ کے کارناموں کا تذکرہ بہت دشوار ہے۔ انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت تشنہ ہے۔

محسنِ اردو منشی نولکشور

منشی نول کشور کا شمار اردو زبان و ادب کے ان چند محسنوں میں کیا جاتا ہے جن کی کوششوں نے اردو زبان نے حیرت انگیز تیزی سے ارتقائی منزلیں طے کی ہیں، ان کی گرانقدر علمی خدمات علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں، تاریخ ادب اردو میں ان کا ایک نمایاں مقام ہے۔ اسلامی علوم و فنون کی جو خدمات ان کے ہاتھوں انجام پائی ہیں ان کو انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کوئی سر انجام نہ دے سکا۔ اسی لئے ان کی شہرت ہندستان و پاکستان سے نکل کر تمام اسلامی ممالک میں پھیلی، یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے ان کی بے مثل علمی خدمات کو سراہا ہے بڑے بڑے علمی و ادبی خزانوں کو دستبرد زمانہ سے محفوظ رکھنے کا سہرا انھیں کے سر ہے، دنیا کے سامنے انھوں نے ایسی نادر و نایاب کتابیں پیش کی ہیں جن کے منظر عام پر آنے سے علوم و فنون کے سلسلۂ ارتقاء کی تاریخی کڑیوں کو مربوط کرنے میں غیر معمولی مدد ملی ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں منشی نول کشور کا مطبع سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ ادبیات اردو کا یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے کہ تذکرہ نویسوں نے منشی نولکشور کے حالات اور ان کی خدمات کے ذکر میں بخل سے کام لیا، یہی سبب ہے کہ تاریخ ادب کی کسی کتاب میں ان کے حالات پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ حالانکہ انکی ذات بجائے خود

ایک انجمن تھی، جو خدمات انھوں نے انجام دی ہیں، واقعہ یہ ہی کہ بہت سی انجمنیں اور ادارے مل کر بھی انجام نہ دے سکے۔

ابتدائی حالات

منشی نول کشور ۱۸۳۶ء میں موضع بستوئی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی جمنا داس بھارگو ذی علم شخص تھے اور ان کی علم دوستی مشہور تھی۔ ان کے والد داد منشی بال مکند بھارگو انگریزی عہد میں آگرہ میں مہتمم محافظ خانہ تھے اور آگرہ اور متھرا میں کافی جائداد خرید لی تھی۔

منشی نول کشور کے علاوہ منشی جمنا داس کے پانچ بیٹے تھے اور سب لائق و ہونہار تھے لیکن کسی میں منشی نول کشور جیسی ذہانت و ذکاوت نہ تھی، اسی لئے ان میں سے کوئی بھی وہ عزت و شہرت حاصل نہ کر سکا جو منشی نول کشور نے اپنی خداداد قابلیت کی حاصل کی۔

ابتدا میں اس زمانہ کے عام رواج کے مطابق منشی نول کشور کو مقامی مکتب میں عربی فارسی کی تعلیم دلوائی گئی۔ اس وقت ان کی عمر چھ سال تھی جب دس سال کے ہوئے تو آگرہ کالج میں داخل کرا دیے گئے۔ جہاں مسلسل پانچ سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس زمانے میں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ اور اخبار "سفیر" آگرہ میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے، کتابوں کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا، اردو ادب سے ان کو بہت ذوق تھا، اس کم عمری میں ان کے شوق مضمون نگاری کو دیکھکر حکومت نے ہمت افزائی کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ صحافت نگاری کی طرف ان کا میلان روز بروز بڑھتا گیا۔

لاہور میں قیام

اس زمانے میں لاہور سے "کوہ نور" اخبار نکلتا تھا جس کے مالک منشی ہرسکھ رائے صاحب تھے، جو خود

صاحب علم تھے اور اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے، منشی نول کشور نے ذوق صحافت نگاری کی تکمیل کے لئے آگرہ سے لاہور کا عزم کیا اور منشی ہرسکھ رائے کے ساتھ "کوہ نور" اخبار میں کام کرنے لگے، اپنی غیر معمولی محنت اور دیانت داری کے باعث جلد ہی منشی ہرسکھ رائے کے معتمد خاص ہو گئے۔ انھوں نے کوہ نور اخبار کو بہت ترقی دی۔ ایک بار منشی ہرسکھ رائے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ماخوذ ہوئے اور قید کی سزا ملی تو منشی نولکشور کو اس سانحہ کا بڑا غم ہوا اور انھوں نے دن رات ایک کر کے پوری جدوجہد کی، اور اپنے مربی کو قید و بند سے آزاد کرا لیا، اس وفاداری نے عوام کے دل میں بھی ان کے خلوص اور دیانت داری کا سکہ جما دیا اور لوگ ان کی عزت کرنے لگے۔ لاہور میں چار سال قیام رہا۔ اب ان کی عمر کا اکیسواں سال شروع ہو چکا تھا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز تھا۔ ہر طرف افراتفری کا دور دورہ تھا، منشی نول کشور وطن واپس جانا چاہتے تھے مگر راستے خطرناک تھے، جیسے ہی حالات اعتدال پر آئے وہ لاہور سے آگرہ واپس آگئے، اور اپنے علم و تجربہ کی بنا پر ایک معیاری اردو اخبار جاری کرنے کا عزم کیا مگر اس مقصد کی تکمیل کے لئے آگرہ کے حالات سازگار نہ تھے اس لئے لکھنؤ چلے آئے۔

اودھ اخبار کا اجراء

لکھنؤ علم و فضل کا گہوارہ اور شاہان اودھ کی راجدھانی ہونے کے باعث ہندوستان کا بہت مشہور مقام تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے اس کی رونق ختم کر دی تھی، شاہان اودھ کی آخری شمع گل ہو چکی تھی، بڑے بڑے اہل علم اور ارباب فضل مصائب آلام کا شکار ہو چکے تھے تاہم مشرقی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا یہ عظیم الشان مرکز تباہ و برباد ہونے کے باوجود بھی مرجع خاص و عام تھا۔

۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور آگرہ سے لکھنؤ آئے اور اسی سال اپنے مطبع کی بنیاد ڈالی، اودھ اخبار نکالنا شروع کر دیا، ابتدا میں پندرہ روزہ رہا، پھر جلد ہی ہفتہ وار ہو گیا۔ ہر کاروبار کی ابتدا میں کچھ نہ کچھ دشواریاں حائل ہوتی ہیں منشی نولکشور کو بھی بہت سی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا، لیکن وہ اپنے تجربات اور ذہانت کے باعث ان پر قابو پاتے رہے۔ سرمایہ کی کمی کے باعث حسب دلخواہ کام نہیں کر سکتے تھے پھر بھی انھوں نے اپنے حسن انتظام اور سلیقہ سے اپنے کاروبار کو صاف ستھرا رکھا، اچھے اچھے مضامین اور بے لاگ تنقید و تبصرہ کے باعث اخبار کو مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ حکومت نے ان کی مساعی کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا، اور سرکاری دفاتر کے کاغذات طباعت کے لئے ملنے لگے، یہ سلسلہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ منشی نول کشور ابتدا میں آمدنی کی کمی کے باعث سرکاری کاغذات طباعت کے بعد خود اپنے کاندھوں پر اٹھا کر دفاتر میں پہنچا دیتے تھے، ان کی کامیابی کا راز ان کی ذاتی محنت اور استعداد میں مضمر ہے۔ سرکاری کاغذات کی طباعت سے جو آمدنی ہوتی تھی، اس سے چھوٹی چھوٹی کتابیں اور رسالے چھپواتے تھے، یہ کتابیں اور قاعدے زیادہ تر اردو ہی کے ہوتے تھے، اخبار کے ساتھ ساتھ کتابوں کے کاروبار میں بھی ترقی ہونے لگی، کرنل ایبٹ کمشنر لکھنؤ نے مطبع کی سرپرستی کی بلکہ یہ تحریک کرنل صاحب نے کی تھی کہ منشی نول کشور مطبع جاری کریں۔

اردو صحافت نگاری میں اودھ اخبار کا مقام

منشی نول کشور خود ایک اچھے صحافت نگار تھے اس لئے انھوں نے "اودھ اخبار" کو بھی صحافت نگاری کے صحیح اصولوں پر چلایا جس کی بدولت وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اس زمانے میں لکھنؤ سے اور اخبار بھی نکلے

"کارنامہ" پہلے سے نکل رہا تھا، مگر "اودھ اخبار" کے سامنے کوئی نہ ٹھہر سکا، "کارنامہ" بھی کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا، منشی نول کشور نے "اودھ اخبار" کے سفیر اور نامہ نگار مختلف صوبوں اور بڑے بڑے شہروں میں مقرر کر دیے، اس طرح پورے ملک کی تازہ خبریں "اودھ اخبار" میں شائع ہونے لگیں، کہا جا سکتا ہے کہ "اودھ اخبار" ہی اردو کا وہ پہلا باقاعدہ اخبار تھا جس نے اخبار نویسی کے جملہ اصولوں پر ممکن ذرائع سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر محمد حسن اپنی کتاب "ادبی تنقید" میں لکھتے ہیں:۔

"اودھ اخبار کئی حیثیتوں سے اہمیت رکھتا ہے اور یہ اردو صحافت کے اس دور میں جاری ہوا تھا۔ جب صحافتی کساد بازاری اپنے عروج پر تھی، اخبار نئے نئے نکلنے شروع ہوئے تھے، اس لئے شوق کو پورا کرنے کے لئے اکثر وہ لوگ میدان میں اتر رہے تھے جن کی گرہ میں دام نہ تھے اور جن کو صحافت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ لکھنؤ سے "کارنامہ" اور "اودھ اخبار" نکلنا شروع ہوئے۔ "کارنامہ" جلد ختم ہو گیا، لیکن "اودھ اخبار" نے اردو ادب میں تاریخی اہمیت حاصل کی۔ اودھ اخبار نے سرشار اور شرر کو اردو ادب سے روشناس کرایا۔

منشی نول کشور نے اودھ اخبار کے لئے اس دور کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کرنے کی کوششیں کیں، وہ بڑے مردم شناس آدمی تھے، ان کی کوششوں سے بہت سے گمنام اہل علم و فضل اردو زبان و ادب کو ترقی دینے کیلئے میدان میں آئے اور ان میں سے بعض اتنے مشہور و مقبول ہوئے کہ آج اردو زبان و ادب کو ان پر فخر ہے۔ رتن ناتھ سرشار اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے اور انھوں نے اپنی

مشہور کتاب "فسانۂ آزاد" قسطوار اودھ اخبار ہی میں شائع کی تھی۔ یہ افسانہ مسلسل اودھ اخبار میں چھپتا رہا اور آج اردو زبان کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ خوجی کا شہرۂ آفاق کردار "فسانۂ آزاد" کی بدولت ملا۔

ابتدائی دور میں اودھ اخبار کے عملۂ ادارت میں منشی غلام احمد، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی ہادی علی رشک، مولانا عبد المجید سحر کاکوروی، رتن ناتھ سرشار، نسیم دہلوی اور عبد الحلیم شرر جیسے یکتائے روزگار اہلِ قلم شامل ہوئے۔ درمیانی دور میں مرزا حیرت دہلوی، سید حالب دہلوی مرحوم، منشی نادر حسین کاکوروی، منشی پریم چند، منشی احمد علی کامل، منشی دوارکا پرشاد افق اور نوبت رائے نظر جیسے اعلیٰ اہلِ قلم نظر آتے ہیں۔

آخری دور میں مرزا عسکری لکھنوی، مرزا یاس چنگیزی، دیبی پرشاد سحر، بشن نرائن در، عبد الباری آسی، آمید امیٹھوی، پیارے لال شاکر، شوکت تھانوی، پیرزادہ فدا حسین اور قاضی نصیر الدین احمد جیسے باکمال اسکے حلقۂ ادارت میں شامل رہے۔ مدیران اودھ اخبار کی تعداد بہت زیادہ رہی اور مستقل مضمون نگاروں کی ایک بڑی تعداد ہے اور ان میں سے بیشتر اردو ادب کے درخشندہ چاند تارے ہیں۔ اودھ اخبار منشی نول کشور کی زندگی میں بامِ عروج پر پہونچ چکا تھا، سارے ہندوستان میں شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ گورنمنٹ میں اس اخبار کا بہت اثر تھا۔ جنگِ آزادی کی تحریک، اور دوسری قومی تحریکوں کا علمبردار تھا، ابتدائی دور میں مرزا غالب، سرسید، حالی اور نذیر احمد وغیرہ اسی اخبار کو پڑھتے تھے۔ غالب کے کئی خطوط میں اودھ اخبار کا ذکر نظر آتا ہے، اس اخبار کی شاندار تاریخ ہے۔ اس نے اردو ادب کے خزانے کو رنگا رنگ جواہرات سے بھر دیا۔ یہ اردو کی عمارت میں ایک مستحکم ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۵۰ء تک یہ اخبار

شائع ہوتا رہا لیکن اسی سال منشی نولکشور کے ورثا نے مطبع اور بک ڈپو کو تقسیم کر دیا جس کا اثر اخبار پر پڑا اور چار و ناچار بند کر دیا گیا۔

مطبع کا عروج و خدمات

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد لکھنؤ جو تہذیب تمدن کا گہوارہ اور علوم و فنون کا سرچشمہ تھا اُجڑ گیا اہل علم و فن تباہ و برباد ہو گئے، ادیبوں اور شاعروں کے قدرداں نہ رہے۔ علما و فضلا نان شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ علم و دانش کی مشعلیں حوادث روزگار کے تھپیڑوں سے بجھنے لگیں، لکھنؤ چھوڑ چھوڑ کر ادیب شاعر ملک کے مختلف حصوں میں منتشر ہونے لگے بڑے بڑے نادر کتب خانے کوڑیوں کے مول بکنے لگے، اسی زمانے میں یعنی ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے اپنا مطبع قائم کیا، جس کے لئے حضرت گنج کے مشہور محلہ میں نواب غالب جنگ کی کوٹھی کا کچھ حصہ لے لیا اور کام شروع کیا، اُردو کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اپنے دوست منشی محمد احسن صاحب کاکوروی کے مشورے سے قرآن شریف کے پارے طبع کرائے اور اس کے بعد قرآن شریف شائع کئے، جس سے ان کے کاروبار کو بہت ترقی ہوئی اور قرآن شریف کی اشاعت کا کام بڑھاتے گئے۔ اس میں ان کو بہت فائدہ ہوا۔ اب منشی نول کشور کی دوربین نگاہوں نے اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ علم و ادب کے جواہر پاروں کو دستبرد زمانہ سے محفوظ رکھنے کا طریقہ یہی ہے کہ ان کو حاصل کر کے شائع کیا جائے، اسی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے علما، و فضلا، کو جو معاشی بحران سے دوچار ہو کر اودھ کو چھوڑ رہے تھے، ایک مرکز پر جمع کر کے ان کے کمالات سے فائدہ اُٹھایا جائے تاکہ آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہو سکیں، اس سلسلہ میں انھوں نے شاہان اودھ اور دوسرے امراء و فضلاء کے کتب خانوں سے نادر و نایاب قلمی کتابیں

خرید کر شائع کرنا شروع کر دیں اور اس دور کے اچھے اچھے علماء، فضلاء اور شعراء کی خدمات حاصل کیں اور ان کے مرتبہ کے مطابق ان کو قدر و منزلت سے رکھا اور فکر معاش سے آزاد کر کے علم و فن کی خدمت میں لگا دیا۔

مصنف "اردو کے ہندو ادیب" حضرت ناظر کاکوروی لکھتے ہیں:۔

"لکھنؤ میں جس قدر مشہور حفاظ، عالم، مورخ، ادیب اور شاعر اس مطبع میں بیک وقت جمع ہو گئے تھے ہندوستان کے کسی دوسرے مطبع کو نصیب نہ ہوئے"

منشی نول کشور نے ابتداء سے اپنی غیر متعصبی اور وسعت نظر کا سکہ جما دیا تھا وہ مذہبا ہندو تھے لیکن بحیثیت انسان بہت بلند نظر تھے اور مذہبی تعصب سے کوسوں دور تھے۔

یہ حقیقت ہو کہ منشی نول کشور نے سب سے زیادہ اردو زبان کی خدمت کی۔ ایک طرف انھوں نے اردو زبان کی اچھی اچھی کتابیں چھپوانا شروع کیں اور دوسری طرف عربی فارسی اور سنسکرت کی بڑی بڑی کتابوں کے ترجمے اردو میں کرنے کا ایک عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے اردو زبان میں نثری داستانوں کی اشاعت کا ایک بہت بڑا سلسلہ شروع کیا جس سے ان کی عالی حوصلگی کا اندازہ ہوتا ہے، طلسم ہوشربا داستان امیر حمزہ کے سلسلہ کو آگے بڑھایا، اودھ کے آخری دور کے داستان گوؤں کی خدمات حاصل کیں اور "آفتاب شجاعت" "لعل نامہ" "ہومان نامہ" "طلسم جمشیدی وغیرہ مختلف ناموں سے ضخیم حجم کی تقریبا ساٹھ جلدیں شائع ہوئی تھیں اور اس قدر ان کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی، طلسم ہوش ربا اس دور میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ تنہا اس کام ہی سے منشی نول کشور نے اردو زبان کو بہت فائدہ پہنچایا لیکن انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا

کیا بلکہ فارسی سے کئی داستانوں کا اُردو میں ترجمہ کرایا۔ خواجہ امان کی "بوستان خیال" شائع کی، اردو نثر کی اس وقت جتنی بھی قابل قدر کتابیں تھیں ان میں سے شاید ہی کوئی اشاعت سے رہ گئی ہو۔ ان ہی کی بدولت اُردو ادب کو "فسانۂ آزاد" ملا، اسی طرح اردو ادب کے تمام مشہور شعراء کے دیوان اور کلیات فراہم کئے اور ان کو شائع کیا، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، آتش، ناسخ، غالب، مومن، ذوق اور ظفر کے دیوان اور انیس، دبیر، مونس اور خلیق وغیرہ کے مراثی شائع کئے۔ اُردو زبان کے تذکرے اور تاریخیں جس قدر بھی دستیاب ہوئیں سب چھاپ دیں۔ مطبع کے ایک قدیم ملازم منشی شیو پرشاد نے (1) (جن کی عمر اس وقت پچانوے سال سے زیادہ ہے) مجھے بتایا کہ منشی نول کشور مطبع کے دورِ عروج میں اُردو زبان کا کوئی مسودہ واپس نہیں کرتے تھے، گویا ان کا شوق اشاعت اُردو اس درجہ ترقی پر تھا کہ رطب و یابس سب ہی کو چھاپتے گئے۔

اسی کے ساتھ انھوں نے ایک دار الترجمہ قائم کیا اور عربی، فارسی اور سنسکرت کے ایسے عالموں کی خدمات حاصل کیں جو اُردو بھی اچھی طرح جانتے تھے اور ان سے مذکورہ زبانوں کی مشہور و بلند پایہ کتابوں کے اُردو میں ترجمے کرائے۔ یہ بجائے خود ایک عظیم الشان کام تھا، جس کے لئے ایک بڑے ادارے اور کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی، مگر بانی مطبع کی عالی ہمتی قابل داد ہے کہ انھوں نے اس کام کو تنہا جس پیمانے پر انجام دیا، اس کی مثال نہیں مل سکتی، فارسی سے اُردو میں کئی سو کتابیں ترجمہ ہوئیں، جن میں شاہ نامہ فردوسی"۔ "مثنوی مولانا روم"، "سیر المتاخرین"، "تاریخ فرشتہ" "تاریخ ابی الفدا"، "ذخیرہ خوارزم شاہی"۔ "اکسیر اعظم" "کیمیائے سعادت"۔ "تفسیر حسینی"۔ "آئین اکبری"، وغیرہ

(1) ۱۹۵۰ء میں وفات پا گئے۔

قابل ذکر ہیں، عربی سے بھی کئی موٹی بڑی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرایا مثلاً فتوحات واقدی" "فتاوی عالمگیری" (دس جلدوں میں) "احیاء علوم الدین الغزالی" "عین الہدایہ شرح و ترجمہ مشکوٰۃ شریف" (پانچ ضخیم جلدوں میں) "درِ مختار" "شرح وقایہ" "ہدایہ" "کنز الدقائق" "بخاری شریف" اور اس طرح کی بڑی بڑی کئی سو کتابوں کے ترجمے کرائے، جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ سنسکرت سے "رامائن" "مہا بھارت" "سکھ ساگر" "بھاگوت گیتا" اور دوسری مذہبی اور ادبی کتابیں اُردو میں منتقل کرائیں۔

خود منشی نولکشور نے اپنے اہتمام میں بے شمار مذہبی اور ادبی کتابیں اُردو میں تیار کرائیں، قرآن شریف کی تفسیر مواہب الرحمٰن تیس ضخیم جلدوں میں مولوی امیر علی ملیح آبادی مرحوم سے تیار کرا کے شائع کی، اُردو میں اس سے بڑی تفسیر کوئی نہیں اور عربی میں بھی اس ضخامت کی شائع شدہ تفاسیر مشکل سے ملیں گی۔ بخاری شریف کا اردو ترجمہ اور شرح بھی تیس جلدوں میں تیار کرائی جو شائع نہ ہو سکی۔ اس طرح کئی کئی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرائیں۔

منشی نول کشور نے اُردو زبان میں تمام علوم و فنون کی ہزاروں کتابوں کو منتقل کرا کے اُردو کے دامن کو اتنا وسیع کر دیا کہ وہ ایک مختصر مدت میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں کھڑا ہونے کے قابل ہو گئی۔

منشی نول کشور نے فارسی، عربی کی ہزاروں بڑی چھوٹی نادر و نایاب کتابیں شائع کیں۔ جن کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ان کے لئے ایک علیحدہ مضمون درکار ہے۔ یہاں صرف مطبع نول کشور کے ان کاموں کا تذکرہ مقصود ہے جو اردو زبان سے متعلق ہیں۔ یہ اس مطبع کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس نے اسکی شہرت و عظمت کو

لازوال بنادیا، ان ترجموں کی بدولت اُردو میں مختلف علوم و فنون پر لکھنے والوں کیلئے میدان بن گیا اور اس کے بعد مختلف موضوعات سیکڑوں کتابیں منظرِ عام پر آنے لگیں - بقول ڈاکٹر محمد حسن :-

"۱۸۵۸ء میں جب منشی نول کشور نے اپنا مطبع کھولا تو علم و ادب کے نئے ذخیرے سامنے آگئے ...... نول کشور پریس ہمارے ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اگر نول کشور پریس نہ ہوتا تو اردو ادب کی روایات نہ ہوتیں اور غالباً ہماری زبان ایک ایسی زبان نہ ہوتی جو اپنا ماضی نہیں رکھتی ۔ نول کشور پریس نے اردو ادب کو اس کا ماضی دیا اور اسکی روایات کو زمانے کے دستبرد سے محفوظ کر کے ہمیشہ کے لئے اردو ادب کے نئے رجحانات کی پشت پناہی کے لئے استوار کردیا۔"

منشی نول کشور نے ایک طرف "اودھ اخبار" کو بام عروج پر پہنچایا اور دوسری طرف نئی نئی کتابیں لکھواکر شائع کیں اور "دارالترجمہ" کے کام کو وسعت دی ۔ اتنے اہم کاموں کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسکولی کتابوں کا کام بھی شروع کردیا ۔ اس کو ایسے ضبط و نظم سے چلایا کہ سارے ہندوستان میں اسی مطبع کی اُردو کتابیں نصابِ تعلیم میں داخل ہوگئیں ماہر اُستادوں سے ریڈر اور قواعد اُردو اور دوسرے مضامین کی کتابیں اُردو میں تیار کرائیں، مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی مشہور ریڈریں اسی مطبع نے شائع کیں اور اب تک انکا سلسلہ جاری ہے ۔ ان کے علاوہ اردو زبان میں دوسرے مضامین کی کتابیں اُردو کے بیسیوں طرح کے قاعدے اور ہر درجہ کی درسی کتابیں بہت کثرت سے شائع کیں، یہ ایک بڑا کام تھا ۔

دورِ عروج میں مطبع اور بک ڈپو میں کئی سو آدمی کام کرتے تھے، دفتر کافی بڑا تھا منشی نول کشور نے تمام دفتری کاروبار اُردو میں رکھا اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

عربی فارسی کی مطبوعات

منشی نول کشور نے اُردو کے علاوہ عربی فارسی زبانوں کو بھی ترقی دی۔ فارسی ادبیات کے لئے ان کی خدمات بہت سود مند ہوئیں۔ انھوں نے ایران اور ہندوستان کے تمام بلند پایہ فارسی شعراء کے دیوان، کلیات اور نثر پارے ہزاروں کی تعداد میں شائع کرائے، اسی طرح عربی زبان میں مذاہب اسلام سے متعلق کتابیں دور دراز مقامات سے حاصل کر کے شائع کیں، حدیث کی مشہور کتابوں کو انھوں نے طبع کردیا اور بعض کے اُردو میں ترجمے کرائے۔ قرآن شریف کی کئی عربی تفاسیر طبع کرائیں۔ فیضی کی مشہور زمانہ بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" کی طباعت کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔

اردو، فارسی اور عربی کے کئی مستند اور جامع لغات شائع کئے، جن میں فرہنگ آنند راج" (فارسی) تین ضخیم جلدوں میں "ہفت قلزم" (فارسی) سات حصوں میں، "مؤید الفضلاء" اور "جامع اللغات" دو حصوں میں مفتی غلام سرور لاہوری سے تیار کرائی تھی یہ اُردو کا مستند لغت ہے۔

غیاث اللغات، (فارسی)، فصیر اللغات، (اُردو) قاموس (عربی) صراح (عربی لغت حدیث) "فقہ اللسان" عربی شائع کیں۔

اُردو فارسی میں انھوں نے لغات کشوری تیار کرائی جو اس وقت ہندستان اور پاکستان میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ایک درجن اور چھوٹی بڑی لغت کی کتب شائع کیں۔ غرض منشی نول کشور نے اپنے مطبع کے ذریعہ اُردو زبان کو دنیا کی

زندہ زبانوں کی صفِ اول میں کھڑا کرانے میں پوری مدد کی، مشرقی علوم وفنون اور زبانوں کی ترقی میں ان کا بہت بڑا حصّہ ہے، انھوں نے ہندی اور سنسکرت کی کئی سو کتابیں شائع کیں۔ ایک قابل ذکر بات اور ہے کہ منشی نول کشور نے اُردو ہندی کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی بڑی کوشش کی، انھوں نے اُردو فارسی کی اچھی اچھی متعدد کتابیں ہندی رسم الخط میں طبع کرائیں اور وہ آج تک رائج ہیں، مصنف تاریخ ادب اُردو نے لکھا ہے :-

"اس مطبع نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی اور اس کی ترقی پر بہت اثر ڈالا۔ نادر کتابوں کی اشاعت مشہور کتب عربی و فارسی کے تراجم، جدید کتابوں کی پبلک مذاق کے مطابق تیاری اور اسکولی کتابوں کی تیاری سے ادب اُردو پر بہت بڑا احسان کیا۔"

منشی نول کشور مرزا غالب کی نظر میں

مرزا غالب کو منشی نولکشور کے کارناموں کی اطلاعات ملتی رہیں، اودھ اخبار پابندی سے غالب کے پاس پہونچتا تھا، منشی نول کشور نے مرزا سے خط وکتابت کے ذریعہ ان کی تصانیف کی اجازت مانگی، پہلی بار مرزا نے جو خط منشی نول کشور کے نام فارسی میں لکھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا غالب انھیں کس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے :-

"امروز سخن می گویم با کسے کہ دیدۂ رویش نادیدہ است و دل بہ مہرش گرویدہ، دیدۂ دیدار جوے اوست و روے دل بہ سوے اوست۔ بر سرِ سوادِ ایں نامہ کہ از دست بہ من رسید میانِ مردم چشم د

سویدائے دل ستیزہ روئے دارم آں ہمی خواہست کہ ہمہ او را باشد
وایں می جست تا ہمہ بر یابد۔ من درمیان آمدم وازپرخاش بازو داشتم
با یکے بہرہ گرفت و آشتی پدید آمد۔ دیدہ را فروغ مبارک و دل را
فروغ ارزانی"۔ (از کلیات نثر غالب مطبوعہ نولکشور، ۱۰ جولائی ۱۸۶۰ء)

اس خط کے تقریباً دو سال بعد منشی نول کشور سے مل کر کس درجہ متاثر ہوئے۔ اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو مرزا نے علاءالدین خاں بہادر کو ۳ دسمبر ۱۸۶۲ء کو لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:-

"شفیق مکرم ولطف مجسم منشی نول کشور صاحب بہ سبیل ڈاک یہاں
آئے۔ مجھ سے اور تمہارے چچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خاں
سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی
ہے، گویا بجائے خود قران السعدین ہیں" (اردوئے معلٰی صفحہ ۳۳ مطبوعہ مجتبائی)

مرزا کی دوربیں نگاہوں نے پہلی ہی ملاقات میں منشی نول کشور کے بشرے سے ان کے کارناموں اور خدمتوں کا جائزہ لے لیا جو ان کے ہاتھوں انجام پانے والی تھیں۔ اس وقت تک جو کچھ کر چکے تھے، وہ غیر معمولی نہ تھا، ملک میں انکے کارناموں کی شہرت پھیلنے لگی تھی۔ ایک دوسرے خط میں غالب نے مردان علی خاں رعنا کو لکھا ہے:-

"منشی نول کشور صاحب یہاں آئے تھے مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت
اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ تمہارے وہ
مداح اور میں ان کا ثنا خواں، خدا تم کو اور ان کو سلامت رکھے" (خطوط غالب)

بلند ہمتی کا ایک واقعہ منشی نول کشور کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی مشہور ہے

مطبع کے ابتدائی دور میں جب ان کا کام چل نکلا تھا اور اخبار کی وجہ سے حکومت میں بھی ان کی رسائی ہو چکی تھی ۔ ان دنوں کلکتہ میں وائسرائے ہند کا ایک دربار منعقد ہوا ۔ اخبار نویس کی حیثیت سے منشی نول کشور بھی اس میں مدعو تھے، کلکتہ کے دوران قیام میں کاغذ سے لدا ہوا ایک بڑا جہاز یورپ سے کلکتہ کے ساحل پر پہونچا، کاغذ کے نیلام کرنے کی تاریخ مقرر ہوئی ۔ اس مقررہ تاریخ پر منشی نول کشور بھی وہاں پہونچے، جہاز سے تھوڑا کاغذ بطور نمونہ اُتارا گیا تھا وہ خراب تھا، اس لئے کلکتہ کے لکھ پتی تاجروں نے قیمت بہت کم لگائی، منشی نول کشور نے سب سے زیادہ قیمت لگادی، نیلام ان کے نام چھوٹ گیا، ساتھی بہت پریشان ہوئے کیونکہ چوتھائی رقم فوراً جمع کرنی تھی اور ان کے پاس روپیہ بالکل نہ تھا ۔ منشی نول کشور ذرا بھی نہیں گھبرائے، کلکتہ کے بعض احباب سے کچھ قرض لیا، لکھنؤ تار دے کر روپیہ منگایا، غرض چوتھائی رقم جمع کر کے کاغذ اُتروانا شروع کیا، اندر سے سب کاغذ عمدہ نکلنے لگا ۔ کلکتہ کے جو تاجر بولی بولنے سے گھبرائے تھے اچھا کاغذ دیکھ کر ان کے منھ میں پانی بھر آیا اور خریداری کی بات چیت کرنے لگے ۔ منشی نول کشور نے مناسب قیمت میں نصف سے زیادہ کاغذ فروخت کر دیا اور بقیہ اپنے مطبع کے لئے لکھنؤ لے آئے، اس طرح کئی ہزار روپے کا نفع ہوا ۔ اسی روپیہ سے لکھنؤ آکر مطبع کے لئے علیحدہ ایک بڑا قطعہ زمین خرید لیا، کوٹھی غالب جنگ میں اپنی رہائش اور بک ڈپو رکھا اور نئی زمین پر پریس کے لئے عمارات تعمیر کرائیں جن میں ایک پریس چل رہا ہے ۔

امیر افغانستان کی قدردانی

منشی نول کشور کی مالی ساکھ مضبوط ہو گئی تھی اور حکومت اودھ نے ان کو روساکی فہرست میں

جگہ دی، درباروں اور جلسوں میں بھی کرسی ملی، کامیاب اور باعزت اخبار نویس اور ساتھ ہی رئیس ہونے کے باعث حکومت نے ان کا اعزاز بڑھایا۔ "سی ۔ آئی ۔ اے" کا خطاب ملا ۔ اس زمانے میں پنجاب کے مشہور شہر لدھیانہ میں گورنر جنرل کا دربار منعقد ہوا امیر عبدالرحمن والی افغانستان بھی آئے ہوئے تھے ۔ ہندستان کے تمام والیان ملک اور روسا شریک تھے، منشی نول کشور بھی مدعو تھے اور ان کی کرسی والیان ملک کے برابر تھی، اس پر ان لوگوں نے گورنر جنرل سے یک زبان ہو کر شکایتا کہا ۔ "منشی نول کشور ایک تاجر ہیں ۔ ہماری ریاستوں میں سیکڑوں کروڑپتی تاجر ہیں مگر ہماری برابری کی مجال کسی کو نہیں ہے، پھر ان کو ہمارے برابر کرسی کیسے دی گئی"

گورنر بہادر نے اس اعتراض کا جواب دیا اور کہا کہ "مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ منشی نول کشور کی قدر و عزت نہیں کرتے، انھوں علوم و فنون کی جو خدمتیں کی ہیں اس کی وجہ سے ان کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے ان کا نام اور کام زندہ رہنے والا ہے" اس جواب سے سب خاموش ہو گئے، یہ خبر امیر عبدالرحمن کے کانوں میں پہونچی اور انھوں نے گورنر بہادر کے ذریعہ منشی نول کشور کو اپنے پاس بلایا اور بڑی عزت تکریم کی، اپنی مسند پر برابر بٹھلایا اور کہا کہ "میری نظر میں آپ کی بڑی عزت ہے ۔ میں نے اپنے ملک کے بڑے بڑے کتب خانوں میں آپ کی شائع کردہ مذہبی اور تاریخی کتابیں دیکھی ہیں، آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے، آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی بلکہ میرا یہ سفر محض اس لئے کامیاب رہا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی، میں چاہتا ہوں کہ آپ افغانستان میں بھی اپنے انتظام سے ایک مطبع قائم کریں، میں ہر قسم کی مدد کروں گا،، منشی نول کشور نے وعدہ کیا کہ اگر حالات

سازگار رہے تو ضرور یہ اقدام کروں گا۔ ہندستانی رؤسا کو منشی نول کشور اور امیر عبدالرحمٰن کے ان بے تکلفانہ ملاقاتوں پر بہت حیرت رہی، اسی طرح دوسرے ممالک کے بڑے بڑے علماء اور ذی اقتدار لوگ منشی نول کشور کی بڑی عزت کرتے تھے اور یہ سب عزت و تکریم محض علوم و فنون کی بدولت تھی۔ اودھ کے چیف کمشنر مسٹر ونگفیلڈ صاحب نے ۱۸۶۱ء میں ایک خط لکھا تھا جسمیں ظاہر کیا تھا کہ منشی نول کشور بڑے لائق شخص ہیں اور اودھ میں ان کا مطبع سب سے اچھا ہے۔

قومی اور ملکی خدمات

منشی نول کشور نے اپنے اخبار اور پریس کے ذریعہ جو کچھ بھی کیا وہ ملک کی خدمت تھی مگر اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی دولت کو بھی رفاہ عام کے کاموں میں صرف کیا، اور پوری دریادلی کے ساتھ سیکڑوں بیواؤں، یتیموں اور نادار طلبار کے لئے وظائف مقرر کردیے۔ کئی شفاخانے قائم کئے، تعلیمی اداروں کو مالی امداد دی "آگرہ کالج" جو انکی تعلیم گاہ تھی، جب اسکی مالی حالت خراب ہوئی تو انھوں نے ایک گرانقدر رقم دے کر حالت درست کی اور بیس ہزار روپیہ دے کر ہوسٹل قائم کرایا اور پندرہ سو روپیہ سالانہ کی جائداد وقف کی۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کو سرسید احمد خاں کی تحریک پر دس ہزار روپیہ نقد اور اس سے دوگنی رقم کی کتابیں دیدیں۔ لکھنؤ کا جوبلی کالج"۔ "لیڈی ڈفرن اسپتال" اور "کیننگ کالج"۔ اور الہ آباد کا "کایستھ پاٹھ شالہ"۔ میرٹھ کی "پبلک لائبریری" اور اس طرح کے بہت سے ادارے ان کی فیاضی پر گواہ ہیں۔

اپنی بے مثل دیانتداری اور ان تھک محنت کی بدولت تھوڑے عرصہ میں منشی نول کشور ملک کے اندر اور باہر مشہور ہوگئے، اور بہت بڑی جائداد کے مالک ہوئے جو

خود ان ہی کی پیدا کی ہوئی تھی۔ انتقال کے وقت ایک کروڑ سے زیادہ کی جائداد بلا کسی بار کے موجود تھی۔

حکومت برطانیہ نے ان کی قدر افزائی پورے طور پر کی، الہ آباد یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ کا ممبر نامزد کیا۔ روہیلکھنڈ ریلوے کا ممبر بھی بنایا۔ گورنمنٹ پریس صوبہ آگرہ و اودھ کا نگراں اعلیٰ بنا دیا۔ منشی نول کشور نے ان سب ذمہ داریوں کو بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔

نول کشور پریس کی شاخیں

منشی نول کشور نے اپنی بلند ہمتی کی بدولت جلد ہی ہندوستان کے مشہور شہروں میں مطبع کی شاخیں قائم کرنا شروع کر دیں۔ لاہور، کانپور، اجمیر اور جبل پور میں شاخیں قائم ہو گئیں۔

کارخانہ کاغذ سازی

کاغذ کی اس زمانے میں کمی تھی۔ زیادہ کاغذ یورپ کے ممالک سے آتا تھا، منشی نول کشور کی دوربیں نگاہوں نے اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ اگر ملک میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم ہو جائیں تو ملک کا روپیہ باہر نہ جائے گا۔ خود ان کو کاغذ کی دشواریاں آئے دن پیش آتی تھیں۔ اس چیز کے پیش نظر انھوں نے کاغذ سازی کا ایک بڑا کارخانہ قائم کرنے کے لئے انتظام کیا کمپنی بنائی اور اس کے حصے فروخت کئے، ولایت سے مشینری منگوا کر کام شروع کر دیا۔ ابتدا میں بہت سی دشواریوں کا سامنا ہوا مگر وہ مستقل مزاجی سے کام کرتے رہے ان کی یادگار پیپر مل آج بھی اپنا کام کر رہی ہے۔

نیک نامی اور کامیابی

منشی نول کشور نے جو شہرت اور عزت حاصل کی وہ ان کی خدمات کے مقابلے میں کم ہے، ان کی زندگی

آئندہ نسلوں کے لئے نمونۂ عمل تھی، وہ ایک اوسط درجے کے کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، مگر ان کے حصے میں کوئی بڑی خاندانی جائداد نہیں آئی تھی، کاروبار کرنے کے لئے کوئی رقم ان کے پاس نہ تھی، معمولی رقم سے کام شروع کیا مگر دیانت داری اور انتھک محنت نے ان کے کاروبار کو ترقی دی، ان کا خاص اصول یہ تھا کہ کتابوں کی قیمت بہت کم رکھتے تھے، غریبوں کو علم حاصل کرنے میں ان کی شائع کردہ کتابوں سے بہت مدد ملی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی کتابیں سستے داموں میں گھر گھر پہونچ گئیں، دنیاوی اعزاز بہت کچھ حاصل کرنے کے باوجود ان میں غرور و نخوت کا نام نہ تھا۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ محنت کی یہ حالت تھی کہ لوگوں سے گفتگو کرتے وقت بھی اپنے مطبع اور علاقے کا کام کرتے رہتے تھے، کسی نے ایک بار ان کی زود نویسی پر اظہار حیرت کیا تو انھوں نے کہا "میں دن میں ان کاموں کے ساتھ کم از کم بڑے سائز کے سو صفحات لکھ سکتا ہوں"۔

منشی نول کشور نے جہاں اُردو زبان و ادب کے خزانے کو کتابوں سے مالا مال کر دیا ہو، وہاں اُردو کو اچھے اچھے ادیب اور شاعر بھی دیے۔ ان کی زندگی میں ان کا مطبع علوم و فنون کا ایک ایسا مرکز تھا جہاں پر علم و فن کے ماہر علماء موجود تھے، اُردو کے باکمال ادیب و شاعر بھی تھے اور بہت سے زیر تربیت تھے۔ جو بعد میں ادبی دنیا میں کافی نامور ہوئے۔

۱۸۹۵ء میں منشی نول کشور کا انتقال ہوا۔ انتقال سے قبل اچھے بھلے تھے، کسی مرض میں مبتلا نہ تھے، اچانک طبیعت بگڑی اور روح پرواز کر گئی۔ اس وقت

ان کی عمر انسٹھ سال کی تھی۔ اگر چند سال اور زندہ رہتے تو یقیناً اردو ادب و زبان اس سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہوتی جتنی اب ہے۔

منشی نول کشور کی اچانک موت ملک و قوم اور علمی و ادبی دنیا کے لئے ایک عظیم سانحہ تھا۔ سارے ملک میں ان کا غم منایا گیا، نعش کو بے پناہ ہجوم کے باعث اسپشل ٹرین سے کانپور لے جایا گیا جہاں دریائے گنگا کے کنارے آخری رسوم ان کے صاحبزادے منشی پراگ نرائن بھارگوا کے ہاتھوں ادا کی گئیں۔

شعر و شاعری کے متعلق
اسلامی نقطۂ نظر

شعر و شاعری کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے عربی شاعری کے اس پس منظر کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے جو ظہور اسلام سے قبل تھا جس کی بنا پر قرآن شریف اور پیغمبرِ اسلامؐ نے شعر و شاعری کی مذمت فرمائی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں شعر و شاعری کا عام چرچا تھا، قطع نظر بعض محاسن کے عربوں کی شاعری لغو اور گمراہ کن افکار و نظریات کی ترجمان تھی، شاعری کے اثرات اخلاقی اقدار کی بیخ کنی کا باعث تھے۔ ہر قبیلہ میں عام طور پر ایک دو شاعر ضرور ہوتے تھے، جو معمولی معمولی اختلافات کو اپنے پُر اثر اشعار سے اتنا بڑھا دیتے تھے کہ مختلف قبائل میں خوفناک خونریزیاں ہو جاتی تھیں۔ شعراء انتقامی جذبات کو برابر بھڑکاتے رہتے تھے، جن کے باعث برسہا برس کی جنگوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح نحاشی شراب نوشی اور قمار بازی جیسے معائب کی تشہیر و ترویج میں شعراء کا بڑا حصہ تھا۔

طلوعِ اسلام کے بعد عرب شعراء کی ساری شاعرانہ صلاحیتیں اسلام اور بانیِ اسلام کی مخالفت اور ہجو کے لئے وقف ہو گئیں اور اس مقصد کے لئے سب ایک

مرکز جمع ہو گئے اور قبائل عرب کو اسلام کے خلاف زور و شور سے اُبھارنے لگے جب قرآن پاک کی پاکیزہ اور بے مثل آیات کے سامنے شعرائے عرب کی فصاحت و بلاغت کا چراغ نہ جل سکا اور ان کی شاعری بے اثر ہو گئی تو ان لوگوں نے آیات قرآنی کو اشعار اور آنحضرت صلعم کو شاعر کہنا شروع کر دیا اور اس خیال کی دل کھول کر اشاعت بھی کرنے لگے۔ اسلام کی مذمت کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کی بُرائیوں کو نظم کر کے میلوں اور بازاروں میں سناتے تھے۔ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کے سامنے بڑے بڑے مشہور شعراء کا کلام بے آب بے اثر ہونے لگا تو ان کج فہموں نے کبھی آنحضرتؐ کو شاعر اور کبھی ساحر کہنا شروع کیا جس کی تردید قرآن پاک میں موجود ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ شعرائے عرب کے متعلق قرآن پاک نے اعلان کیا کہ :۔

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝	اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں اے مخاطب کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ (شاعر لوگ (خیالی مضامین کے ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام نے شعر و شاعری کو مذموم قرار دیا ہے اور آیت مذکورہ کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جو شاعری بد اخلاقی اور عیوب کی ترویج کرے اس کو قرآن پاک نے مذموم اور گمراہ کن قرار دیا ہے اور ایسے شعراء کی مذمت کی ہے آنحضرتؐ نے بھی ایسی شاعری اور اس قسم کے شاعروں کو گمراہ قرار دیا ہے۔

لیکن شاعری کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی پوری توضیح و تشریح کے لئے آیت

مذکورہ بالا کے اس استثنائی جزو کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ارشاد فرمایا:۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا	ہاں مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے
الصّٰلِحٰتِ وَ ذَکَرُوا اللّٰہَ	کام کئے اور انھوں نے اپنے اشعار
کَثِیۡرًا وَّ انۡتَصَرُوۡا مِنۡ	میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا اور انھوں نے
بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا ؕ وَ سَیَعۡلَمُ	بعد اسکے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہے (اس کا)
الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ	بدلہ اور عنقریب ان لوگوں کو معلوم
یَّنۡقَلِبُوۡنَ ؓ	ہو جائیگا جنھوں نے (حقوق اللہ وغیرہ میں)
(سورۂ شعراء)	ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی جگہ ان کو لوٹ جانا ہے۔

اس استثناء سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نے تمام شعراء کو گمراہ نہیں کہا ہے اور نہ نفسِ شعر کی مذمت کی ہے بلکہ اس شاعری کی مذمت کی ہے جو گمراہی پھیلانے کا باعث ہے اور ان شاعروں کو بُرا کہا ہے جو اس فطری ملکہ کو غیر فطری اور انسانیت سوز احساسات و افکار کی ترجمانی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان شعراء کو مستثنیٰ کر دیا جو دینِ فطرت پر ایمان لائے اور اخلاقی محاسن و فضائل کی اشاعت کے لیے خدا داد شاعرانہ قوتوں کو صرف کرتے رہے۔

آفتابِ اسلام کی کرنوں نے انسانی زندگی کے ہر گوشہ کو منور کیا، شاعری نے بھی اسکی روشنی میں اپنے متعین حدود دیکھ لئے، یہی سبب تھا کہ عرب کے بہت سے بلند پایہ شاعر جن کے قلوب نورِ ایمان سے منور ہو چکے تھے مذکورہ آیات کے نزول کے بعد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے (جن میں حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ، کعب بن مالکؓ حسان بن ثابتؓ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں) اور عرض کیا اللہ جانتا ہے کہ ہم شاعر ہیں تو ہم ہلاک ہو گئے؟ آپ نے ان کو اس استثنا کی طرف توجہ دلائی جو الا الذین

آمنوا کے ذریعہ کیا گیا ہے اور سب کو اطمینان دلایا۔

رحمت عالم (صلعم) نے بُرے اشعار کی بہت مذمت فرمائی ہے اور اچھے اشعار کو نہ صرف پسند کیا بلکہ اچھے اشعار آپ سنتے تھے اور شعراء کو اچھے اشعار کہنے کی ترغیب بھی دیتے۔ بعض شعراء کے اشعار میں اصلاحیں بھی دی ہیں آپ نے فرمایا اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً "بیشک بعض اشعار میں دانائی ہے"۔ آپ کے اس قول نے عمومی حیثیت سے شاعری کی مذمت کی تردید کر دی۔

آنحضرت (صلعم) کے مشہور و محبوب صحابی حضرت حسان بن ثابتؓ ایک بلند پایہ شاعر تھے، آپ ان کا کلام سنتے تھے اور تعریف کرتے تھے، کبھی کبھی مسجد نبوی میں بیٹھ کر ان کے اشعار سنا کرتے تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے مشہور شاعر لبید کا یہ مصرع

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ

"آگاہ ہو اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہونیوالی ہے"

سن کر ارشاد فرمایا۔ "یہ نہایت سچا کلام ہے"۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ کے سامنے شعر کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ "یہ بھی ایک کلام ہے، اس کا اچھا حصہ اچھا ہو اور برا حصہ برا ہے"، (بخاری، دار قطنی) عمر بن شریدؓ سے روایت ہو کہ ان کے والد ایک موقع پر آنحضرتؐ کے ہمرکاب تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم کو امیہ ابن صلت (متوفی ۹ ہجری) کا کوئی شعر یاد ہو تو سناؤ"۔ انھوں نے ایک شعر سنایا۔ آپ نے فرمایا اور، انھوں نے اور سنایا۔ یہاں تک کہ آپ نے سو شعر سنے، پھر فرمایا اس کی زبان اسلام سے آ گئی

مگر دل منکر رہا (روایت صحیح مسلم) آپ نے پاس لیئے فرمایا تھا کہ ابن صلت مسلمان نہ تھا مگر اس کے کلام میں حمد الٰہی موجود تھی۔

دربار نبوت کے شعرا اپنے اشعار میں آنحضرتؐ کی مدح اور کفار کی ہجو کرتے تھے۔ جہاد کے موقع پر مجاہدین کو جوش دلانے کے لیئے اشعار پڑھتے تھے، اور آنحضرت کی طرف سے کوئی ممانعت نہ تھی، فتح مکہ کے موقع پر آپ کے صحابی حضرت ابن رواحہؓ آپ کے آگے آگے اشعار پڑھتے ہوئے چل رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو منع کیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "اے عمرؓ ابن رواحہؓ سے معارض نہ کرو، ان کے یہ اشعار مخالفین کے حق میں تیروں سے زیادہ کارگر ہیں"۔

آنحضرتؐ کا شعر کہنا

آپ نے خود بھی بعض موقعوں پر کلام موزوں کو اظہار جذبات وخیالات کا ذریعہ بنایا، ظاہر ہے نہ آپ شاعر تھے نہ شاعری منصب نبوت کے شایان شان تھی تاہم اتفاقیہ طور سے برجستہ زبان مبارک پر موزوں کلام آگیا۔ حضرت ابواسحٰق تابعی سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے غزوۂ حنین میں خدا سے فتح ونصرت کی مدد مانگی اور اس میں فرمایا

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب　　اَنَا ابْنِ عَبْدُ الْمُطَّلِب

ترجمہ:۔ میں نبی ہوں اس میں کچھ جھوٹ نہیں ہے کہ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جب غزوۂ اُحد میں آنحضرتؐ کی انگلی زخمی ہوئی تو ارشاد فرمایا۔

ھل انت الا اصبع دمیت　　وفی سبیل اللہ ما لاقیت

ترجمہ:۔ نہیں ہو تو مگر ایک انگلی (جو) خون آلودہ ہوئی۔ اور راہ خدا میں ہے (وہ تکلیف) جو تجھے پیش آئی۔

غزوۂ خندق کے موقع پر آپ خود صحابہؓ کے ساتھ کام کر رہے تھے بعض صحابہؓ نے کچھ اشعار پڑھے ان کے جواب میں یہ اشعار فی البدیہہ ارشاد فرمائے:-

اللّٰھم لا عیش الّا عیش الآخرۃ — فاکرم الانصار والمہاجرۃ

والعن عضلا والقارۃ — ھم کلفونا ننقل الحجارۃ

ترجمہ:- اے اللہ حقیقی عیش آخرت کا عیش ہے، انصار اور مہاجرین پر کرم فرما۔ عضل اور قارہ پر لعنت فرما جنھوں نے ہمیں پتھر ڈھونے کی مشقت میں ڈالا۔ (بحوالہ فتح الباری ۱۳۱۶ھ)

بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ اسی غزوۂ خندق میں آپ صحابہؓ کے ساتھ مٹی اٹھا اٹھا کر پھینکتے تھے، یہاں تک کہ آپ کا شکم مبارک گرد آلود ہو گیا اس وقت آپ نے فرمایا:-

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا — ولا تصدقنا ولا صلینا

ونزّلن سکینۃ علینا — وثبت الاقدام ان لاقینا

ان الاولیٰ قد بغوا علینا — اذا ارادوا فتنۃ ابینا

ترجمہ:- (۱) خدا کی قسم اگر اللہ ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے نہ صدقہ دیتے نہ نماز پڑھتے۔
(۲) اے پروردگار ہم پر آرام و اطمینان نازل فرما اور جب ہم مخالفین سے مقابلہ کریں تو ثابت قدم رکھ۔
(۳) بیشک ان منکروں نے ہم پر زیادتی کی ہے کیونکہ جب یہ فتنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم انکار کرتے ہیں

آپ کا اصلاح دینا

آں حضرتؐ نے کبھی کبھی شعراء کا کلام سُن کر اس پر اصلاح بھی دی ہے، مشہور شاعر کعب بن زہیرؓ نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جو آج بھی "بانت سعاد" کے نام سے مشہور ہے اور عربی ادب کا ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ قصیدہ سُننے کے دوران میں جب حضرت کعبؓ نے

یہ شعر پڑھا سہ

اِنَّ الرسول یسف یستضاءُ بہ
مہند من یسوف الہند ملولی

ترجمہ:۔ بیشک رسول (آں حضرتؐ) ایک تلوار ہیں جس سے لوگ چمک اور روشنی حاصل کرتے ہیں اور وہ ہندستان کی بنی ہوئی تلوار کے مانند ہیں جو کھنچی ہوئی ہے۔

آپ نے یہ شعر سنتے ہی اس طرح اصلاح فرمائی کہ پہلے مصرع میں یسفؐ (تلوار) کو نُوُرٌ (روشنی) سے بدل دیا اور دوسرے میں یسوف الھند (ہندستانی تلوار) کی جگہ یسوف اللہ (اللہ کی تلوار) کردیا۔ اس اصلاح نے چار چاند لگادیئے، اصلاح کی خوبی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو عربی زبان و ادب سے خوب واقف ہیں، اس اصلاح سے یہ بھی ثابت ہوتا ہو کہ آپ شعر میں زائد الفاظ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے آپ نے مہندٌ (ہندوستانی تلوار) کی موجودگی میں یسوف الھند کو یسوف اللہ سے بدل کر لفظ ہند کو جو زائد تھا نکال دیا۔

اچھے اشعار پر انعام

آں حضرت (صلعم) نے حق گو اور دیندار شعراء کو ان کے اچھے اشعار پر انعام بھی مرحمت فرمایا۔ حضرت کعب بن زبیرؓ جو عرب کے مشہور شاعر تھے جب اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے تو انھوں نے آپ کی شان میں ایک بلند پایہ قصیدہ لکھا جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہو۔ جب آنحضرتؐ نے قصیدہ سُنا تو خوش ہو کر ان کو اپنی استعمالی چادر بطور انعام عطا فرمائی۔ اس چادر مبارک کے لئے حضرت معاویہؓ نے دس ہزار درہم کی پیش کش کی

مگر حضرت کعب نے دینے سے انکار کر دیا، لیکن ان کے انتقال (۵۰ھ ہجری) کے بعد ان کے ورثا سے حضرت معاویہؓ نے بیس ہزار درہم میں خرید لی تھی۔

حضرت حسان بن ثابتؓ عرب کے ممتاز شعراء میں تھے، آنحضرت صلعم ان سے اشعار کہنے کی ہدایت فرماتے تھے اور آپ کے گزر بسر کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا تھا، خلفائے راشدین نے بھی آپ کا وظیفہ باقی رکھا۔ حضرت حسانؓ نے ایک سو بیس برس کی عمر میں انتقال فرمایا اور عمر کا نصف حصہ اسلام کی خدمت میں گزارا۔ آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔

آنحضرت صلعم کے علاوہ صحابۂ کرام نے بھی اخلاقی شاعری کی قدر کی، خلفائے راشدین کے بعض اشعار کتابوں میں ملتے ہیں۔ حضرت علیؓ صاحبِ دیوان مشہور ہیں جو دیوان آپ کے نام سے شائع ہوا ہے گو اس کے مستند ہونے کا کوئی معقول ثبوت نہیں تاہم آپ کے اکثر اشعار مستند کتابوں میں موجود ہیں، ایسے اصحابِ نبیؐ کی تعداد کئی سو تک پہنچتی ہے جو اشعار کہتے تھے ان میں سے اکثر کا کلام شائع ہو چکا ہے۔

صحابہؓ کے بعد علمائے اسلام اور صوفیائے کرام نے شعر و شاعری سے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا کام لیا۔ امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ، امام غزالی اور دوسرے اکابر علماء کے اشعار موجود ہیں جو دلوں پر اثر کرتے ہیں، اخلاقی جذبات کو ابھارتے ہیں بعض علماء نے فقہ، تجوید، تاریخ اور سیرت وغیرہ کی کتابیں نظم میں لکھی ہیں جب آفتاب اسلام کی شعاعوں نے عرب سے نکل کر سرزمین عجم کو منور کیا تو یہاں کی خاک سے بھی بڑے بڑے علماء و فلاسفہ، ادیب اور شاعر پیدا ہوئے۔

فارسی زبان کے بلند پایہ شاعروں میں مولانا جلال الدین رومی، حکیم سنائی

شیخ سعدی شیرازی، مولانا جامی اور بعض دیگر شعراء نے شاعری کے ذریعہ اسلام کی جو خدمت کی ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں، مولانا روم کی مشہور عالم مثنوی اسلامی تعلیمات کی تشریحات کے لئے ایسی مستند اور پُر اثر کتاب ہے جس کے لئے مولانا جامی نے کہا ہے ؎

مثنوی مولوئ معنوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

بیسویں صدی عیسوی میں علامہ اقبال نے اپنے پُر تاثیر اشعار سے احیاءِ دین کی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی جس کے اثرات ہندوستان و پاکستان سے گزر کر کم و بیش سارے اسلامی ممالک پر پڑے۔ اس عنوان پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ تاہم اس اجمالی مضمون کا مقصد یہ ہے کہ شعر و شاعری کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سمجھنے کی راہیں متعین ہو جائیں۔

فنّ خوش نویسی کا ارتقا

خطاطی ایک قدیم و لطیف فن ہے۔ مگر پریس کی ایجاد کے بعد سے اس فن میں نمو کی صلاحیت نہیں رہی اور بیسویں صدی میں تو ہندہی نہیں عرب و عجم میں بھی فن خطاطی گھٹتا رہا ہے، پھر بھی جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کی خطاطی زندہ ہی رہے گی۔ جب تک لال قلعہ اور تاج محل کو دیکھنے لوگ آتے رہیں گے، انھیں خطاطوں کے کمالات کی داد دینا ہی پڑے گی۔

یہ دو نام اس لیے گئے ہیں کہ لال قلعہ خط نستعلیق کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے تو تاج محل خط نسخ کا۔ ورنہ یوں تو پرانے زمانہ کی کون عمارت ہے جو زیور خطاطی آراستہ نہیں ہے اور یہی وہ دو خط ہیں جن میں زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک اُردو کی کتابت ہوتی رہی ہے۔ خط نسخ قرآن شریف کے لئے مخصوص رہا اور خط نستعلیق عام مراسلات کے لئے۔

مردم خیز اُتر پردیش نے دونوں ہی خطوں کے ماہرین پیدا کئے۔ اگر نستعلیق میں منشی شمس الدین اعجاز رقم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، تو فن نسخ میں مولوی حامد علی مرصع رقم علاوہ علم و فضل کے لاثانی تھے، جن کی تصانیف اصول النسخ، تعلیم النسخ اور قطعات الجواہر وغیرہ سے اہل فن اپنی آنکھیں روشن کر رہے ہیں۔

فن خطاطی کی باقاعدہ بنیاد ۳۱۰ھ میں پڑی۔ جب مشہور خطاط ابن مقلہ نے خط کوفی اور خط نسخ کو ترقی دینے اور خوشنما بنانے کے سلسلے میں چھ طرز تحریر ایجاد کئے جن کے نام یہ ہیں۔ خط ثلث[1]، خط توقیع[2]، خط محقق[3]، خط نسخ[4]، خط رقاع[5] اور خط ریحان[6]۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ابن مقلہ نے صرف دو خط ایجاد کئے تھے، باقی دیگر خوشنویسوں کے ایجاد کردہ ہیں۔ ابن مقلہ کے زمانے سے تقریباً ایک صدی تک خط ثلث و خط ریحان اور ایک قسم کا خط نسخ رائج تھا، خوشنویسی میں ابن مقلہ کے برابر اسلامی ممالک میں کسی کو شہرت نہیں حاصل ہوئی۔

پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں علی بن ہلال المعروف بہ ابن ایوب نامی ایک ماہر خوشنویس پیدا ہوا، اس نے سابقہ خطوں کی خوب مشق کی اور ان کو خوبصورت بنانے کی پوری کوشش کی، اس کے زمانے میں خط رقاع کا رواج ہوا، جو موجودہ خط شکستہ سے ملتا جلتا ہے، جس سے خطوط نویسی اور کتابت میں آسانیاں ہوگئیں۔ کیونکہ کتابت کے لئے زود نویسی (خط شکستہ) سب سے زیادہ آسان ہوتا ہے اسی دوران میں خط توقیع کا رواج ہوا جو بادشاہی احکامات اور خلفاء و سلاطین کے خطوط و فرامین میں استعمال ہوتا تھا۔ ابن بواب کے زمانے کے بعد دو سو سال تک خوشنویسی کا تدریجی ارتقا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری میں دنیا کے چند مشہور خوشنویس پیدا ہوئے، جن میں جمال الدین یاقوت مستعصمی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ اپنے تمام پیشروؤں سے سبقت لے گیا اور اس کے زمانے میں چھ قسم کے رسم الخط خوبصورتی اور زیبائش کی اعلیٰ منزلوں پر پہونچے، خاص طور سے

خطِ نسخ اپنی اس شکل وصورت میں مکمل ہوا جو اب تک رائج ہے۔ اس تین سو سال پہلے خطِ نسخ لکھا جاتا تھا لیکن وہ مخصوص خط کو جس کو نسخ یاقوتی کہتے ہیں اسی کا ایجاد کردہ ہے۔ سب سے بڑا کام یاقوت مستعصمی نے یہ کیا کہ خط کو خوبصورت بنانے کے لئے چھ بہترین شاگرد تیار کئے جن میں سے ہر ایک خوشنویسی کا زبردست اُستاد تھا ان کے نام یہ ہیں:۔

یوسف شہدی، شیخ احمد، شیخ زادہ سہروردی، ارغون کامل، مبارک شاہ زریں رقم، سید حیدر جلی نویس، نصر اللہ طبیب۔ ان چھ اُستادوں کی بدولت ساری اسلامی دنیا میں یاقوت کا رائج کردہ خط پھیل گیا اور آہستہ آہستہ مختلف ممالک میں زبردست خوش نویس پیدا ہوئے۔ جن میں احمد رومی، جعفر بایسنغری، عبداللہ طباخ، شمس بایسنغری بہت مشہور ہیں۔ تیموری شاہزادوں میں کئی اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے، جن میں بایسنغر مرزا خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں علاء الدین تبریزی اور علی رضا عباسی بڑے کامل اُستاد گزرے ہیں۔ ان کے بعد سیکڑوں خوش نویس نمایاں ہوئے اور اس فن کو برابر ترقی دیتے رہے۔

آٹھویں صدی ہجری کے آخر تک یہی چھ رسم الخط رائج رہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے لیکن ان میں سے کوئی زود نویسی اور خط و کتابت کے لئے مناسب نہیں تھا اس زمانے میں خواجہ تاج اصفہانی نے خط رقاع اور توقیع کی آمیزش سے تیسرا خط وضع کیا جو تعلیق کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ خط آسان نویسی کے باعث بہت تھوڑی سی مدت میں مختلف ممالک میں رائج ہو گیا اور اس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی

اور ہر ملک میں ایک مخصوص طور پر لکھا جانے لگا۔ چنانچہ خط تعلیق ایرانی، ہندستانی اور ترکی ایک دوسرے سے جدا جدا نظر آتے ہیں۔ خط تعلیق تین سو سال تک خطوط نویسی اور شاہی احکامات وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ اس خط کے مشہور استاد حسب ذیل تھے:۔

عبدالحی منشی استرآبادی، درویش عبداللہ سلطانی، خواجہ اتیاز علی منشی۔ جنھوں نے اس خط کو خوبصورت بنانے کی پوری کوشش کی۔ خط تعلیق کو ملا کر اب سات رسم الخط ہو گئے تھے۔ مولانا جامی نے اپنے قطعہ میں ان خطوں کا ذکر کیا ہے۔

کاتباں را ہفت خط باشد بطرز مختلف ثلث و ریحاں، محقق، نسخ و توقیع و رقاع

بعد ازاں تعلیق آں خط است کش اہل عجم از خط توقیع استنباط کردند اختراع

خواجہ تاج سلیمانی جو پہلے چھ خطوں میں خوب مہارت حاصل کر چکا تھا، اس نے خط تعلیق کی اچھی مشق کی، آخر میں ابو سعید مرزا کے شاگرد منشی عبدالحی نے اس خط میں بہت مہارت پیدا کی اور مولانا درویش نامی بزرگ اس سے بھی بڑھ گئے۔

نویں صدی ہجری کی ابتداء میں یعنی عہد صاحبقراں میں میر علی تبریزی نے خط تعلیق اور نسخ کی آمیزش سے ایک آٹھواں خط ایجاد کیا جو نسخ تعلیق کے نام سے موسوم ہوا اور رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے نستعلیق ہو گیا، اور یہی وہ خط ہے جو آج فارسی اور اردو کا مشہور و متداول خط ہے اور اردو فارسی لکھنے کا سب سے زیادہ خوبصورت خط سمجھا جاتا ہے۔ اس کو خطوں میں عروس کا درجہ دیا جاتا ہے، آج یہ رسم الخط ہندستان، پاکستان، ایران اور افغانستان میں ہر رسم الخط سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔

خط نستعلیق کی ایجاد کا سہرا تو میر علی تبریزی کے سر ہے، مگر اس خط کو خوبصورت

اور پاکیزہ بنانے میں اس کے بیٹے میر عبداللہ تبریزی اور دو شاگردوں نے بہت محنت کی اور اس فن کے اُستاد بن گئے۔ ایک جعفر تبریزی اور دوسرا اظہر تبریزی۔ سلطان علی مشہدی نے اس کی تکمیل میں خصوصیت کے ساتھ بہت جد و جہد کی اور وہ ایک کامل اُستاد بن گئے۔ ان کے چھ شاگرد بہت ماہر خطاط گزرے ہیں۔ سلطان محمد خندان، سلطان محمد نور، مولانا علاء الدین سہروردی، خواجہ زین الدین نیشاپوری، محمد قاسم اور شادی شاہ ان میں سے ہر ایک اُستاد ہوا ہے۔

اس کے بعد مولا میر علی ہروی اعلیٰ نستعلیق ہوئے ہیں جنھوں نے اس خط کے اصول و قواعد کی تکمیل کی۔ یہ خواجہ زین الدین نیشاپوری کے شاگرد تھے مگر استفادہ سلطان علی مشہدی کی تقلید سے زیادہ حاصل کیا، کچھ عرصہ بعد محمد حسین تبریزی، میر سید احمد مشہدی، مولانا شاہ محمود نیشاپوری، میر معز کاشانی، مالک دیلمی، اور مرزا ابراہیم اصفہانی نستعلیق نویسی میں بہت مشہور ہوئے اور میر عماد حسینی قزوینی نے تو اس خط کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دئے۔ ہندستان میں بھی خط تعلیق کا رواج فارسی لکھنے کے لئے ہو چکا تھا، عربی لکھنے کے لئے نسخ رائج تھا، عہد اکبری سے کچھ قبل نستعلیق کا رواج شروع ہوا۔ ہندستانی خوشنویسوں نے تعلیق اور نستعلیق کے درمیان ایک خط شکستہ کے نام سے عہد اکبری میں ایجاد کیا۔ جو بہت مفید ثابت ہوا۔ اس کو خط دیوانی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ خط بادشاہ شاہجہاں کے عہد میں خوب رائج ہوا، اور اب تک اس کا رواج اردو تحریروں میں جاری ہے اور اس میں کافی خوبیاں پیدا کر لی گئی ہیں۔

سطور بالا میں جن اساتذۂ فن کی خوش نویسی کا ذکر کیا گیا ہے ان میں بیشتر

ایران و عراق کے تھے۔ ہندوستان میں بھی اس فن کے ماہر بہت ہوئے ہیں اور ان میں بعض نے ایسے اُستادانہ کمالات دکھائے کہ ایرانی خوشنویس بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ تیموری خاندان کے فرمانروایانِ ہند آرٹ اور ہنر کا بہت شوق رکھتے تھے۔ خود بادشاہوں کو دیگر فنون اور آرٹ کے ساتھ ساتھ خوشنویسی کا بہت شوق تھا۔ شاہجہاں کا بیٹا دارا شکوہ بہترین خوشنویس تھا، سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کو نسخ اور نستعلیق دو خطوں میں مہارت تھی۔ اُن کے ہاتھ کے قرآن شریف آج بھی موجود ہیں۔ ہندوستان میں بڑے بڑے اساتذہ پیدا ہوئے۔ جن میں ملّا حُسین کشمیری، محمد مراد کشمیری، میر محمد مومن وغیرہ نے بہت شہرت حاصل کی۔ ان میں سے ہر ایک نستعلیق نویسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ شاہانِ مغلیہ کی فیاضیوں کے باعث جہاں دیگر علوم و فنون کے ماہرین ایران چھوڑ چھوڑ کر ہندوستان آگئے تھے وہاں بہت سے نامی گرامی خوشنویس بھی آئے تھے، جنہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ اس ملک میں گزار دیا۔ ایسے ماہر خطّاطوں میں عبدالرشید دیلمی (جو میر عماد کا بھانجہ تھا) ہندوستان میں آغا شیدا کے نام سے مشہور ہوا۔ اور سید علی خاں تبریزی جواہر رقم کے نام سے لئے جا سکتے ہیں۔ ان اُستادوں نے ہندوستان میں اپنے جیسیوں شاگرد تیار کئے جن کی بدولت خط نستعلیق ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا، اس زمانے میں بادشاہوں اور امیروں کو اپنے کتب خانوں کے لئے کتابوں کی قلمی نقلیں کرانا پڑتی تھیں، چونکہ چھاپہ خانہ ایجاد نہیں ہوا تھا اس لئے کوئی خوشنویس بیکار نہیں رہ سکتا تھا بعض خوش نویس بڑی محنت اور کاوش سے خط میں خوبیاں اور رعنائیاں پیدا کرتے تھے اور بڑے بڑے انعامات

حاصل کرتے تھے۔ حکومت وقت کی سرپرستی اور امرا، کی فیاضیوں نے اس فن کو زمین سے آسمان پر پہونچا دیا۔

خط نستعلیق اپنی ابتدا، سے تین صدی تک ہندستان نیز ایران میں فارسی کتب کی کتابت کے لئے رائج رہا۔ عام تحریروں میں خط تعلیق ہی استعمال ہوتا رہا۔ گیارہویں ہجری کے دوران میں خط تعلیق کے لکھنے اور پڑھنے کی دشواری کے پیش نظر خط شکست کے طرز پر لکھنے کا رواج ہوا، اور اس نے تعلیق کی جگہ لے لی۔ اس خط کے ایرانی استادوں میں محمد شفیع معروف بہ شفیعا، میرزا حسن کرمانی اور سب سے ماہر شکست نویس درویش عبدالحمید گزرے ہیں۔ خود ہندستان میں مرزا محمد حسین، جعفر کفایت خاں، جلال الدین یوسف، عبداللہ درایت خاں۔ علی اکبر بن کفایت خاں اور محمد مومن وغیرہ فاضل شکست نویس تھے۔

آخرالذکر دو خط یعنی نستعلیق اور شکست اُردو کے مروجہ رسم الخط ہیں جو اُردو کی پیدائش سے ہندستان میں رائج ہوئے اور آج تک اُردو کے لئے یہی دو خط استعمال ہو رہے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ہندستان میں خط نستعلیق کو ہر اعتبار سے بہت ترقی گئی اور ایسے ماہر فن اساتذہ پیدا ہوئے جنھوں نے حیرت انگیز جدتیں کر کے اس رسم الخط کو انتہائی دلکش اور نظر فریب بنا دیا۔ میر عماد الحسینی ایران کے زبردست خوش نویس تھے، ان کے بھانجے عبدالرشید دیلمی نادر شاہ درانی کے حملوں کے زمانے میں ہندوستان آئے اور لاہور میں ٹھہر گئے اور ان کے شاگرد سارے ہندستان میں پھیل گئے۔ عبدالرشید دیلمی کے دو بہت

ہونہار شاگرد تھے ۔ حافظ نور اللہؒ اور قاضی نعمت اللہؒ نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی اور نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے ۔ اسی وقت سے لکھنؤ کی سرزمین خوشنویسوں کا گہوارہ بن گئی ۔

حافظ نور اللہؒ کے دو ممتاز شاگرد تھے ۔ حافظ محمد ابراہیمؒ اور سرب سکھ بہت ماہر خوش نویس گزرے ہیں، ان دونوں کے زیر تربیت منشی عبدالحمید، منشی غلام کشمیری اور مولوی اشرف علیؒ بڑے باکمال نستعلیق نویس تیار ہوئے جو آج بھی اسی طرح مشہور ہیں ۔ رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب بھی حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے اور اچھے خوشنویس تھے ۔ آخری دور یعنی بیسویں صدی میں منشی ہادی علیؒ، منشی اشرف علیؒ اور منشی شمس الدینؒ اعجاز رقم بڑے پایہ کے استاد گزرے ہیں ۔ منشی شمس الدینؒ نے اس فن پر تنویر الشمس، مرقع نگارین اور اعجاز رقم وغیرہ کتابیں تصنیف کیں اور نظم پر دیں کو اپنے قلم اعجاز رقم سے مزین کیا ۔ ان کے ممتاز شاگردوں کی فہرست طویل ہے لیکن منشی محمد افضلؒ نے اس فن میں اتنا ملکہ اور کمال پیدا کیا کہ ان کا جواب نہ تھا اور مسلم طور سے یگانۂ روزگار قرار پائے ۔

دلی میں بھی بڑے بڑے باکمال خوشنویس پیدا ہوئے ۔ آخری دور میں سید محمد پنجہ کش نے بڑی شہرت حاصل کی ۔ سید صاحب کے شاگرد میر عبداللہ بہت مشہور ہوئے ۔ ان کے بعد میر کلن، مولوی حیات علی اور ان کے صاحبزادے منشی کرامت علی بہت ماہر خطاط تھے ۔ میر کلن کے جانشین محمد جان نے اس فن میں مہارت حاصل کی تھی اور دلی کے اکثر اچھے خوش نویس اُن کے شاگرد تھے

دلی میں بدرالدین علی خاں میران نے بھی بہت شہرت حاصل کی۔

ہندستانی نستعلیق نویس اساتذہ نے اُردو رسم الخط (نستعلیق) میں بڑی بڑی جدتیں بھی کی ہیں۔ خطوں میں دور اور سطح کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ سطح سے کشش اور دور سے دائرہ مراد ہوتا ہے۔ ہندستانی اساتذہ نے نستعلیق کے دائروں کو حسب ذیل سات قسموں میں تقسیم کیا ہے اور سات طرح سے لکھا۔ بیضاوی، آفتابی، شلجمی، معشوقی، مصنوعی، گنج یعنی پیوند۔ ان میں آفتابی اور بیضاوی زیادہ رائج ہوئے۔ اسی طرح ان اساتذہ نے خط نستعلیق کے اندر اور ایجادیں کیں جو اپنی خوبصورتی اور نفاست کے باعث بہت پسند کی گئیں۔ ان میں بہت مشہور اور مقبول حسب ذیل ہیں۔

خط گلزار:۔ خفی قلم سے حرف کا دائرہ اور سطح بنا کر اس کے اندر بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔

خط غبار:۔ صرف باریک لفظوں سے پورا حرف لکھا جاتا ہے اور غبار سا نظر آتا ہے۔

خط طغرا:۔ کسی بڑی عبارت کو تھوڑی جگہ میں لکھا جاتا ہے، اگر اس میں کئی دائرے ہیں تو ایک سے کئی دائروں کا کام لیتے ہیں اور اس سے مختلف جانوروں کی شکلیں بنا دیتے ہیں، یا کوئی درخت یا پھول بھی۔

خط ماہی:۔ چھوٹی بڑی مچھلیاں بنا کر حرف کو اس کی اصل صورت میں مکمل کرتے ہیں۔

خط بہار:۔ کسی عبارت کو باریک لکھ کر حرف کی صورت کے مطابق دائرہ

اور کشش بناتے جاتے ہیں۔

نستعلیق توام :- ایک حرف یا عبارت کو سیدھا لکھ کر اس کے مقابل اسی حرف یا عبارت کو معکوس لکھنا۔

اس طرح چند قسمیں اور بھی ہیں مگر زیادہ رائج اور مشہور یہی ہیں۔

موجودہ دور میں بھی ہندستان میں ہزاروں نستعلیق نویس موجود ہیں، اور اس رسم تحریر نے اتنی مقبولیت اور اہمیت حاصل کی ہے کہ اُردو کے تقریباً تمام تر اخبارات و رسائل نستعلیق میں شائع ہوتے ہیں۔ فی زمانہ اُتر پردیش میں نستعلیق کا سلسلہ منشی ہادی علی اُستاد منشی شمس الدین اعجاز رقم سے جاری ہے جن کے شاگرد منشی محمد افضل نے خاص شہرت حاصل کی اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔

علمِ جغرافیہ کی تدوین و ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

اپنے دورِ عروج میں مسلمانوں نے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کیلئے امتیازی خدمات انجام دی ہیں۔ مادی ترقی کے اس دور میں علمی اور نظری علوم و فنون نے ہماری عقلوں کو متحیر کر رکھا ہے لیکن اہل دانش جانتے ہیں کہ موجودہ مادی ترقیوں کی شاندار عمارت اس بنیاد پر قائم ہے جو علماء و محققین اسلام نے رکھی تھی، تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ مسلمانوں نے جس علم و فن پر توجہ کی، اس کو تمام ممکن وسائل سے کام لے کر ترقی دی۔

جغرافیہ کی تدوین و ترقی مسلمان سیاحوں اور عالموں کی رہین منت ہے۔ ان سے پہلے کسی قوم نے جغرافیہ پر کوئی خاص تعمیری کام نہیں کیا تھا، مسلمانوں نے اس کو ترقی دے کر ایک سائنٹیفک علم بنا دیا اور نئے تجربات کی روشنی میں نئے نئے نظریات دنیا کے سامنے پیش کئے۔ اس سے قبل یونانی علماء و فلاسفہ نے علم جغرافیہ پر توجہ کی تھی، ان میں سب سے بڑا عالم و محقق بطلیموس تھا جس نے عرض البلد اور طول البلد معلوم کر کے شہروں کے مقام متعین کئے اور ان کے فاصلے بتائے۔

بس یہی دو کام قابل ذکر ہیں، جو یونانیوں اور رومیوں نے انجام دیئے۔

ہندستان کے علماء نے ریاضی نجوم اور فلسفہ میں بہت ترقی کی، لیکن جغرافیہ سے کبھی ان کا کوئی تعلق نہ تھا، دنیا کی کسی قوم نے اس طرف توجہ نہیں کی تھی مگر مسلمانوں نے اس کو ترقی دے کر بہت آگے بڑھا دیا۔

جغرافیہ کی تدوین و ترقی کے لئے ضروری تھا کہ دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کی جائے۔ دریاؤں، جھیلوں اور آبشاروں کو دیکھا جائے، خوفناک جنگلوں دشوار گزار گھاٹیوں اور پُرپیچ وادیوں کی سیر کی جائے، ہر مقام کی آب و ہوا کی خصوصیات معلوم کی جائیں۔ مختلف علاقوں کے باشندوں کے حالات، تہذیب اور معاشرت کی رنگارنگی، پیداوار وغیرہ سے واقفیت حاصل کی جائے۔ مسلمان سیاحوں اور تاجروں نے یہ سب کچھ کیا۔ جغرافیہ کی طرف مسلمانوں کی توجہ کے کئی خاص سبب تھے۔ اول یہ کہ اسلام سے قبل عرب کے لوگوں کا ذریعۂ معاش عموماً تجارت تھا، اور وہ دوسرے ممالک میں خرید فروخت کے لئے جاتے تھے۔ فروغ اسلام کے بعد تجارت کو اور بھی ترقی ہوئی، کیونکہ اسلام نے تجارت کو بہترین ذریعۂ معاش قرار دیا تھا۔ تجارتی اغراض کے لئے مسلمانوں نے دوسرے ممالک کے سفر کثرت سے کئے اور اس طرح ان کو جغرافیہ کی معلومات حاصل ہونے لگیں، دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمان اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت کے لئے دوسرے ملکوں میں جاتے جس کا ان کو حکم دیا گیا تھا۔ بعض ملکوں پر مسلمانوں نے لشکرکشی کی، فوجی ضروریات کے پیش نظر کثرت سے جاسوس اس ملک کے گوشہ گوشہ میں بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح ملک کی گزرگاہوں دریاؤں، پہاڑوں وغیرہ کے علاوہ وہاں کے عام حالات سے بھی واقفیت حاصل کر لیتے تھے اس طرح جغرافیہ کی معلومات کا کافی ذخیرہ فراہم ہو گیا۔

تیسرا اہم سبب جس سے علم جغرافیہ کو ترقی ہوئی وہ فریضۂ حج ہے جو جغرافیہ کی ترقی میں مسلمانوں کا معاون ثابت ہوا۔ دنیا کے گوشہ گوشہ سے مسلمان فریضۂ حج کی ادائگی کے لئے مکہ میں جمع ہوتے تھے۔ ایک دوسرے سے ملتے تھے اپنے ملک کے حالات بیان کرتے اور دوسروں کے حالات معلوم کرتے، اس تمام اہم جغرافی معلومات اکٹھا ہوتی رہیں۔ مشہور مورخ جغرافیہ داں یاقوت حموی اپنی کتاب معجم البلدان میں لکھا ہے کہ :-

"علم جغرافیہ میں مسلمانوں کی ترقی کا سب سے بڑا سبب فریضۂ حج ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس کافی ذخیرۂ معلومات جمع ہو گیا"

مسلمان علماء و فضلاء نے صرف زبانی حاصل ہونیوالی معلومات کو کافی سمجھا، بلکہ انھوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور عملی حیثیت سے فن جغرافیہ کو ترقی دینے کا عزم کیا اور دنیا کی سیر و سیاحت شروع کی، ایسے علماء اور سیاحوں کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن ان میں چند ایسے ہیں جو اپنے کارناموں کے باعث ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔

ابو عبد اللہ محمد الادریسی بہت مشہور جغرافیہ داں تھا، اس نے قرطبہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی صقلیہ میں اسکی شہرت پھیل چکی تھی، اس لئے جب وہاں گیا تو بادشاہ راجر (ثانی) نے اسکی بہت آؤ بھگت کی اور چاندی کا کرۂ ارض (گلوب) بنانے کا حکم دیا جسمیں دنیا کے تمام پہاڑ، دریا اور اہم مقامات نظر آسکیں۔ ادریسی نے ساڑھے پانچ من چاندی صرف کرکے راجر کے حسب خواہش ویسا ہی کرہ بنا دیا اور بادشاہ سے کافی انعام حاصل کیا۔ ادریسی نے پندرہ سال تک مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی اور جن مقامات کا سفر کیا ان کو اپنے نقشہ میں دکھلایا۔ اس نے اپنی کتاب میں ۶۹ نقشے بنائے، سفر کے مفصل حالات لکھے۔ دریائے نیل کا منبع جس کو گزشتہ صدی میں معلوم کیا گیا ہے وہ پہلے ہی دریافت کر چکا تھا۔

اسکی کتاب قرون وسطیٰ کی کتابوں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔

اسی سلسلہ میں ابن جبیر اندلسی قابل ذکر ہے اس کا اصل نام ابو الحسن محمد تھا، اس نے بہت سے ممالک کا سفر کیا اور جغرافی معلومات یکجا کرتا رہا، اس نے بحیرۂ روم کے خطے میں بسنے والی قوموں کے تمدن، تجارت اور تہذیب سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کا نام "رحلۃ ابن جبیر" ہے۔

مشہور مؤرخ ابو ریحان البیرونی نے ہندستان کی سیاحت کی اور مدتوں قیام کر کے یہاں کے جغرافی اور طبیعی حالات کو شرح و بسط سے لکھا۔ اس نے ہندستان کے مذاہب اور تہذیب و معاشرت پر جس تفصیل سے روشنی ڈالی، وہ ہندستان کی سیاحت کرنیوالا کوئی سیاح نہ کر سکا۔ البیرونی نے دنیا کا جو نقشہ اس وقت بنایا تھا، آج بھی وہ صحیح سمجھا جاتا ہے اسکی لکھی ہوئی کتاب "الہند" عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہے

مسلمان سیاحوں میں "ابن بطوطہ" کا نام سر فہرست نظر آتا ہے۔ جس نے علم جغرافیہ کے لئے کافی مواد چھوڑا ہے۔ اس کا شمار دنیا کے مشہور سیاحوں میں ہوتا ہے۔ اس نے اندلس سے چین تک اور روس سے افریقہ تک کی سیاحت کی تھی اور ان ممالک کے جغرافی حالات لکھے۔ اسکی کتاب کا مسودہ ایک بحری سفر میں ضائع ہو گیا تھا، پھر اس نے وطن پہونچ کر دوبارہ جو سفرنامہ لکھا تھا وہ شائع ہو چکا ہے اور اس سے جغرافیہ کی تدوین میں بہت مدد ملی۔

اسی طرح المسعودی ایک زبردست ماہر جغرافیہ تھا جس نے مانسونی ہواؤں کے متعلق بہت سی مفید باتیں لکھی تھیں۔

نویں صدی عیسوی میں بغداد کے عباسی خلفاء نے فن جغرافیہ کی ترقی میں غیر معمولی جد و جہد کی، خلیفہ المامون کے عہد میں دنیا کی پہلی باقاعدہ رصد گاہ قائم ہوئی تھی جہاں

اجرام فلکی کے متعلق مشاہدات و معلومات حاصل کی جاتی تھیں، اس عہد میں بہت سے مفید آلات بھی ایجاد ہوئے مثلاً سمندر کی گہرائی ناپنے کا پیمانہ اور سمت معلوم کرنے کے آلے۔ المامون کے حکم سے درجہ عرض البلد کی پیمائش کر کے زمین کی جسامت معلوم کرنے کا کیا گیا، اسی عہد میں مشہور تاجر اور سیاح سلیمان گزرا ہے جس نے سواحل ہند سے چین تک سفر کیا، اس کا سفرنامہ ۸۵۱ء میں لکھا گیا جس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایک اور عالم ابن وہب نے بھی ۸۷۰ء میں چین تک سفر کیا تھا، اس کا سفرنامہ اتنا دلچسپ تھا کہ بعض لوگوں کا خیال ہو الف لیلیٰ کے سندباد جہازی کے حالات کی بنیاد اسی سفرنامہ پر رہی۔

اسی صدی عیسوی میں مشہور جغرافیہ داں ابن خورزادبہ نے جغرافیہ کی سب سے پہلی باقاعدہ کتاب "المسالک والممالک" لکھی جسمیں ہر ملک کے مختلف حصوں کے حالات ہیں۔ اس کا پورا نام ابوالقاسم عبداللہ ابن خورواذبہ ہے، یہ ۸۲۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا اور ۹۱۲ء میں وفات پائی، نسلاً ایرانی تھا، اس نے اپنی کتاب مقام "سامرہ" میں لکھی تھی۔ اسی طرح مشہور عالم یعقوبی نے نئے طرز کی کتاب "کتاب البلدان" لکھی تھی اور احمد ابن یعقوب عباسی اور ابن سراقیون نے جغرافیہ پر مفید کتابیں لکھیں۔

دسویں صدی عیسوی میں بڑے بڑے ماہرین جغرافیہ موجود تھے، ان میں سب سے بڑا عالم المسعودی تھا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔
